



سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی عہد

تصانیف نیاز پختوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والی
انجیل انسانیت

من ویزدال

مولانا نیاز پختوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف صحافت کا
ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام
نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ" داخوت عامہ کے ایک رشتہ
سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہو اور جس میں مذاہب کی
تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ
کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے
نہایت بلند انشاء اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہو
صفحہ ۶۷۲ صفحات، مجلد نور و پیہ لعلہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہو
ان کی مختصر ہرست یہ ہے:- اصحاب کہف، معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار، مذہب، عقائد، طوفان نوح، خضر
کی حقیقت، حسن یوسف کی داستان، قارون، سامری، علم غیب، دعا
توبہ، لقمان، عالم برزخ، یاجوج ماجوج، باروت ماروت
حوض کوثر، امام مہدی، نور محمدی اور پل صراط، آتش نمرود وغیرہ
صفحہ ۶۲۴ صفحات کاغذ سفید و بیز قیمت علاوہ محصول پاکو روپیہ آٹھ آنے

نگارستان جمالتان

حضرت نماز کے بہترین ادبی مقالہ
اور انسانوں کا مجموعہ نگارستان نے
ذہن میں جو قبول حاصل کیا اس کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد
مضامین غیر زبان و نہیں نقل کئے گئے
اس آڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی
مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو
پچھلے آڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے
صفحہ ۶۷۲ صفحات، مجلد نور و پیہ لعلہ علاوہ محصول

حسن کی عیالیاں

اور دوسرے افسانے
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا
بہترین استخراج آپ کو نظر آئے گا اور
ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر
واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے اوراق
میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں
حضرت نیاز کی انشاء نے اور
زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جلیبی یا

شہوانیات مجلد
اس کتاب میں فحاشی کی تمام نثری
اور غیر نثری قسموں کے حالات
تاریخی و نفسانی حقیقت نہایت شرح
و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا
وضوح ہوگا کہ فحاشی دنیا میں کب کس طرح رائج
ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کدو میں
کتنی مکی اس کتاب میں آپ کی حیرت انگیز
واقعات نظر آئیں گے۔ نیا آڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

دی مغل لائن لمیٹیڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

خاص حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتی ہے کہ اس کا مندرجہ ذیل جہاز بندرگاہ بمبئی سے حاجیوں کو لیکر روانہ ہوگا

ایس۔ ایس۔ "مظفری" وزن ۷۰۲۴ ٹن

۲۸ جون ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ بمبئی سے روانہ ہوگا

روانگی کی صحیح تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

کرایہ (معہ خوراک) بمبئی سے جدہ اور واپسی

درجہ اول - ۱۱۵۱ روپے

عرشہ (ڈیک) - ۴۱۵ روپے

ان کرایوں میں جدہ کی صفائی کے محصولات اور ٹرانسپورٹ کے اخراجات جو مجموعی طور پر ۲-۸۴ روپے ہوتے ہیں، شامل نہیں ہیں۔
عازمین حج کے پاس انٹرنیشنل فارم پر ہمیشہ اور چیک کے ٹیکے لگوانے کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہئے۔ بیفے کے سرٹیفکیٹ میں
اہم اطلاع یہ درج ہونا ضروری ہے کہ عازم حج نے سات روز کے وقفے سے دو انجکشن لے لئے ہیں اور یہ دوسرا انجکشن جہاز کی

روانگی کی تاریخ سے کم از کم سات روز قبل لیا گیا ہے۔ اسی طرح چیک کے سرٹیفکیٹ میں یہ اندراج ہونا چاہئے کہ جہاز کی روانگی کی تاریخ سے
کم از کم چودہ دن قبل چیک کا ٹیکہ لگوا لیا گیا ہے۔ سرٹیفکیٹ مقررہ انٹرنیشنل فارموں پر مقامی میونسپلٹی کے محکمہ حفظان صحت کے حکام
سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ بیفے کے سرٹیفکیٹ ۶ ماہ تک اور چیک کے سرٹیفکیٹ ۳ سال تک کارآمد ہوں گے۔
عازمین حج کو چاہئے کہ ابھی سے بیفے اور چیک کے ٹیکے لگوا کر سرٹیفکیٹ طیارہ رکھیں۔

نشستیں محفوظ کیجئے جہازوں کی نشستیں محفوظ کی جا رہی ہیں۔ عازمین حج کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا تاخیر اپنے نام ہائے
ہاں درج کرائیں۔ درخواست میں مندرجہ ذیل تفصیلات کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) ہر ایک عازم حج کا پورا

نام (۲) والد شوہر کا نام (۳) عمر (۴) پورا پتہ (۵) کس درجے کا ٹکٹ درکار ہے؟ (۶) کن تاریخوں میں سفر کا ارادہ ہے؟ اگر ساتھ میں بچے
ہوں تو ان کا نام وغیرہ درج کرنا بھی نہایت ضروری ہے، خواہ وہ خیر خواہ ہی کیوں نہ ہوں۔ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی
لیکن یہ ضرور ہے کہ جن کے نام ہمارے ہاں درج ہوں گے ان کو ٹکٹ پہلے دئے جائیں گے۔

ٹرنر مارینس اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

مینجنگ ایجنٹ، دی مغل لائن لمیٹیڈ

۱۶، بینک اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی

نشستیں محفوظ کرانے کا پتہ:-

تار کا پتہ: 'MOGUL'

BOMBAY

تنقیدی اشائے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبہ ادب و لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں شامل ہے پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سندھی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات کاغذ ۲۸ پونڈ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ مینجر نگار لکھنؤ

”میرا مذہب“

(از چودھری محمد علی رئیس ردولی)

اگر آپ شیعہ ہیں تو اس کتاب کو اس لئے پڑھئے کہ آپ سنی ہو جائیں
اگر آپ سنی ہیں تو اس لئے پڑھئے کہ شیعہ ہو جائیں اور اگر آپ کچھ نہیں
ہیں تو اس لئے پڑھئے کہ آپ کو اس دنیا میں رہنا ہے اور انسان
بنکر رہنا ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔ مینجر نگار۔

کیا اس کتاب کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں
اگر نہیں۔ تو پہلی فرصت میں اسے طلب فرمائیے

”۵۵ سال کے بعد“

یہ کتاب نصیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لکھی گئی ہے کہ آپ
اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی
نہیں سکتے جب تک اسے ختم نہ کر لیں۔
یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ:-

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر
۱۔ دنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔
۲۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔
قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ علاوہ محصول۔ مینجر نگار۔

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

ناواقف لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے
کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت
کا خیال نہیں کیا اور اس کو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے
نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ
کہ گہوارہ سے نیکر لحد تک عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح
کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو
اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب
میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث
نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ
صحت قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کتاب نہایت
نفیس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کی گئی ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول
مینجر نگار لکھنؤ

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے اس سے زیادہ میرا پس
کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری

یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک
اسکے مراح موجود ہیں۔ داغی کمزوری کیلئے اکیس صفت ہے
جوان بوڑھے سب کھاتے ہیں اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور
کشتہ جات بیکار ہیں اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور باؤ
گھم کر سکتے ہیں اس قدر مقوی داغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے
لگتی ہیں اسکو مثل آپ حیات کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا
وزن کر لیجئے ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دیگی اس کے استعمال
کرنے سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی اور یہ دوا رخسار وں کو مشکل
علاج پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دیگی۔ یہ دوا نئی نہیں ہے بلکہ
ہزاروں مایوس علاج اسکے استعمال سے باہر ادبیکر مثل مندرہ سولہ سال کے جوان
بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے القطار کی
صفت تھکر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا
بھر میں نہیں ہے۔ قیمت فی شیشی ۲۴ روپے چار روپیہ (ملحدہ)
نوٹ:- فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس نہرست دوا فائدہ مفت منگائیے۔ میں لکھنؤ
خاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکیس کام کرتی ہے نقاوت ہوتا ہے

میری ۳۲ سالہ شہرت پر غور فرمائیے
حکیم ثابت علی بیج زبان خوش کلام

(عالم شنوی مولانا روم صاحب)
محمود نگر لکھنؤ یو۔ پی

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۱	مضامین جون ۱۹۵۲ء	شمارہ ۶
--------	------------------	---------

مشاہداتِ زنداں	 مولانا حسرت موہانی مرحوم	۳۲ - ۴
تسلیم لکھنوی	 مولانا حسرت موہانی مرحوم	۵۶ - ۳۳

مشاہدات زندان

(مولانا حسرت موہانی)

تہہ ۲۳ جون ۱۹۵۲ء کو اردوئے معلّے پر مقدمہ سڈیشن قائم ہوا اور ۴ اگست ۱۹۵۲ء کو دو سال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانے کا حکم سنایا گیا۔ علی گڑھ میں ہر شخص جانتا ہے اور اسی لئے مجسٹریٹ علی گڑھ کو بھی غالباً اس بات کا علم ہوگا کہ اڈیٹر اردوئے معلّے ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے اس پر بھی ۵۰۰ جرمانہ کرنے کا سوا اس کے اور کیا مطلب ہو سکتا تھا کہ اردوئے معلّے اور کتب خانہ اردوئے معلّے کی برادری میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہے۔ تاہم ہمیں مجسٹریٹ علی گڑھ کے اس حکام کی شکایت نہ اب ہے نہ کبھی ہوئی اور نوعیت مقدمہ کے لحاظ سے ان کی غیر معمولی سختی پر کبھی تعجب ہوا نہ اب ہے، اس لئے کہ جب تک ہندوستان میں مجسٹریٹ پولیس کے ہی اعلیٰ افسر رہیں گے اور خفیہ پولیس کی ان جھوٹی رپورٹوں کو سن کر جن کی تردید کا فرض ملزم کو کوئی موقع نہ ملتا ہے نہ مل سکتا ہے، فیصلہ مقدمہ سے قبل ہی رائے قائم کر لیا کریں گے، جب تک کہ وہ خود ایک شخص پر الزام لگائیں اور وارنٹ جاری کریں گے اور پھر خود ہی اس کا انصاف کرنے بیٹھیں گے، اس وقت تک فوجداری کے اکثر مقدمات میں عموماً اور پولیٹیکل مقدمات میں خصوصاً خالص انصاف یا رفاہی کی امید کرنا اول درجہ کی حماقت ہے کیونکہ پولیٹیکل مقدمات میں ایک اور خرابی یہ بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ ملزم اکثر فریگیول اور فرنگی حکومت کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور اس کا ظا سے یورپین مجسٹریٹ کے دل میں اس کی جانب سے بغض و کدورت کا پیدا ہونا ایک ایسا قدرتی امر ہے جس کی نسبت ہم اس کو الزام نہیں دے سکتے، یہ قصہ طول و طویل ہے، بہر حال اڈیٹر اردوئے معلّے کو علی گڑھ جیل اور چند روز کے بعد الہ آباد سنٹرل جیل میں جانا پڑا۔ جہاں حکام کے اشارے یا خود الہ آباد جیل کے یورپین سپرنٹنڈنٹ کی رائے سے اس کو معمولی قیدیوں سے بھی زیادہ سختی برداشت کرنا پڑی تھی اور تقریباً سال بھر ایک من آٹا پیسے کی اس سخت مشقت سے سابقہ رہا جو عام طور پر دیگر قیدیوں سے بھی ایک ماہ سے زیادہ نہیں لیجاتی۔ کھانے

پینے اور عام برتاؤ کی ابتری کے بیان سے ہم دیدہ و دانستہ اس لئے قطع نظر کرتے ہیں کہ مبادا قومی فریق پر یہ الزام قائم ہو کہ ان میں اپنے یقین اور عقیدے کی خاطر سختی برداشت کرنے کی کافی ہمت نہ تھی اسی باعث سے وہ لوگ بعد میں سرگرم شکایت ہوتے ہیں۔

تاہم منجملہ دیگر خاص سختیوں کے ایک کا بیان، محض برسبیل تذکرہ نہ طرز شکوہ و شکایت ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ عام طور پر قیدی جیل میں داخل ہونے کے بعد کام میں لگا دئے جاتے ہیں اور اگر وہ اپنا کام بخوبی انجام دیتے رہیں تو ان پر کچھ ایسی سختی یا نگرانی نہیں کی جاتی، وہ لوگ دوسرے قیدیوں سے بے تکلف مل جل کر اوقات گزاری کر سکتے ہیں اور کم از کم اعاطہ جیل کے اندر کسی نہ کسی طرح پر جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔ لیکن ہم پولیٹیکل قیدیوں کی خوش قسمتی دیکھئے کہ جیل کے اندر ایک دوسرے جیل میں رہنا پڑتا ہے یعنی ایک خاص وارڈ یا بعض اوقات ایک خاص کوٹھری کے علاوہ جیل میں بھی نہ کسی دوسری جگہ جاسکتے ہیں نہ کسی سے بات کر سکتے ہیں سچر اس وارڈ یعنی جیل در جیل میں دوسرے قیدیوں کے برخلاف اس قدر نگرانی کی جاتی ہے کہ الامان و الحفیظ۔ عام قیدی چرا چھپا کر کبھی کبھی اچھی غذا بھی حاصل کر سکتے ہیں، ہم نہیں کر سکتے۔ عام قیدی جن کو نوشت و خواند کا کوئی کام سپرد کر دیا جاتا ہے۔ چرا چھپا کر کتاب وغیرہ بھی دیکھ سکتے ہیں اور کاغذ و پنسل بھی رکھ سکتے ہیں ہم یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ مزید نگرانی کے علاوہ ہر وقت بالکل برہنہ کر کے تلاشی لئے جانے کا اندیشہ موجود رہتا ہے۔ عام قیدی نصف یا قریب نصف میعاد گزر جانے پر برقعہ دار بنادئے جاتے ہیں جن کا کام صرف دوسرے قیدیوں کی نگرانی کا رہ جاتا ہے اور فی ماہ چھ یا آٹھ روز رہائی کے مستحق ہو جانے کے علاوہ نسبتاً جیل کے اندر زیادہ آزاد بھی ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ کسی نامعلوم وجہ سے ان تمام حقوق سے محروم ہیں۔

اذیت مصیبت ملامت بلائیں

حقیر نے بمصدق ہے

اس اک عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

ان تمام باتوں کو برداشت کیا اور بے تکلف برداشت کیا، کچھ تو جانب حق ہونے کے یقین سے دل کو تقویت تھی اور کچھ اس فطری بے غمی اور بے پروائی کا فیضان تھا جس کی بدولت شعراء و نقراء ہر حال میں راضی اور خوش رہ سکتے ہیں کہ فقیر کے دل پر بھی ان واقعات و حالات کا ذرہ برابر بھی مضر اثر نہ ہوا بلکہ حسن پرستی و وطن پرستی کے جذبات نے نمایاں بندی حاصل کی قالمحمد للہ علی ذلک۔

تمام مذکورہ بالا موافقات کے باوجود یہ کل غزلیں دن بھر مچکی پینے کے اشنا میں بھی جاتی تھیں اور بوقت شام ایک قیدی دوست کو لکھوادی جاتی تھیں جو بحیثیت برقعہ دار نسبتاً زیادہ آزاد تھے اور مخصوص طور پر زیر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ و پنسل بھی اپنے پاس چھپا کر رکھ سکتے تھے۔ راقم کی رہائی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ دوست بھی رہا ہوئے اور ان چند غزلوں کے سوا جو کسی طرح ضائع ہو گئیں باقی کل غزلیں ان سے دستیاب ہو گئیں۔ ابتدا میں صرف چند متفرق غزلیں کھسی گئی تھیں لیکن میر مظفر حسین صاحب فوق متوطن ضلع بجنور کے اصرار سے (جو خود بھی الہ آباد جیل میں قید تھے اور اب رہا ہو گئے ہیں) کل ردیفوں میں غزلیں طیار کی گئیں اور اس طرح ہر ایک مختصر سا دیوان مرتب ہو گیا۔ فقیر کی لائبابی طبیعت سے اس پابندی کی امید نہ تھی اسلئے میر صاحب موصوف کا اصرار خاص شکریئے کا مستحق ہے۔

۲۳ جون سنہ ۱۹ جون سنہ ۱۹۵۱ء

ہر زمانہ قید فرنگ جو کچھ راقم حروف نے دیکھا یا سنا اس کے شایع کرنے کا بوجھ چند در چند ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر اب یہ قصد کر لیا گیا ہے کہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت چند دلچسپ واقعات اور حالات پیش کر دئے جائیں، ابتداءً صرف ان نتائج کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کل واقعات کو بغور دیکھ کر فقیر کی طبیعت نے اخذ کئے ہیں۔

حسرت موہانی

تمام بھیڑ بھاڑ کے موقعوں پر عموماً اور تیسرے درجے کے ریلوے سفر میں خصوصاً عوام اہل ہند کی جہالت مفلسی اور بیکسی کا نظارہ دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان لوگوں کو سیاسی معاملات سے دلچسپی حاصل ہونے کے لئے ایک عرصہ دراز درکار ہے اور اسوقت تک آزادی ہند کا خیال خواب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ خواص کے غرور اور عوام کے انکسار کی بدولت ان دونوں کے درمیان تبادلہ خیالات کی نوبت ہی نہیں آنے پاتی ورنہ صاف ظاہر ہو جاتا کہ جمہور اہل ہند میں سیاسی اصول کے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد کافی مقدار میں موجود ہے۔ زندانِ فرنگ میں راقم حروف کو ایک قیدی کی حیثیت سے عوام کے درمیان بغایت بے تکلفی اور برابری کے ساتھ رہنا پڑا اور اس طرح پر ان کے اصل جذبات اور خیالات کے معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ راقم کے خیال میں عوام ہند کی حیرت انگیز ذہنی تمام سیاسی مسائل کو باوجود کم علمی بلکہ بے علمی، بہت جلد اور بہت اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر سکتی ہے۔ جس مسئلہ کا ان کے رویہ ذکر ہوا اُسے وہ لوگ چشمِ زدن میں نہ صرف سمجھ گئے بلکہ اس کے متعلق ایسی سنجیدہ رائے بھی ظاہر کی جس کی بنیاد ان سے کوئی توقع نہ ہو سکتی۔ اسی ضمن میں ہم کو فریقِ گرم کے برسرِ حق اور نرم گروہ کے خطا پر ہونے کا قطعی ثبوت بھی پہونچا۔ کیونکہ سودشی بوائیکاٹ قومی تعلیم اور پنچایت کے اصولوں کو عوام نے بلا تکلف سمجھا اور پسند کیا۔ برخلاف اس کے موجودہ نظامِ حکومت کی اصلاح اور عرضِ معروض کی پالیسی کو ان سب نے بالاتفاق مہل قرار دیا۔ اور اس قسم کے غلط اصول کی پیروی کو خبط اور تضییعِ اوقات سے تعبیر کیا۔ لاریب جمہور کا یہ طبعی رجحان ہمارے مذکورہ بالا دعوے کا قطعی اور آخری ثبوت ہو

جن لوگوں کو خواص اپنے زعم میں ناپاک اور رذیل سمجھ کر تمام اعلیٰ صفات سے محروم اور تعلیم و تہذیب سے مستفید ہونے کے قابل قرار دیتے ہیں۔ ہم نے ان سب کو بخوبی آزما کر دیکھا اور سمجھیں یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ قیود سے متعلق تقریباً کل اصول یک قلم باطل ہیں اور تہذیب و تعلیم کے نقص و کمال کا دار و مدار صرف سوسائٹی کی اچھائی یا برائی پر منحصر ہے۔ ہم نے اپنے قیدی دوستوں میں جن لوگوں کو سب سے زیادہ ذہین و شریف و علم دوست پایا ان میں ایک پاسی ایک کچے بندھیا ایک ہندو تیلی اور ایک مسلمان تیلی تھا۔ ہم بلا خوف تردد یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ادنیٰ اقوام کو حصول علم و تہذیب کے ذرائع حاصل ہوں تو وہ لوگ بلاشبہ ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۱)

جس شخص نے کبھی قید خانے کی صورت نہ دیکھی ہو وہ تو وہاں کے حالات سے کسی طرح آگاہ ہو ہی نہیں سکتا لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ جو لوگ جیل کی سیر بطور وزیٹر کیا کرتے ہیں وہ بھی کما حقہ وہاں کے اندرونی حالات سے واقف نہیں ہو سکتے، کس لئے کہ ملازمان جیل کی سختیاں گھڑکیاں اور گالیاں - فڈائے زنداں کی حد سے زائد ابتر حالت - حاکمان جیل کے ظلم اور بے انصافیاں ان سب کی اصلی کیفیت قیدیوں کے سوا اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی۔

یادش بخیر لالہ لال چند فلک نے آخر شعبہ میں بزمانہ سورت کانگریس کچھ حالات زنداں لاہور کے سنائے تھے لیکن جیل کی حقیقت راقم کے ذہن نشین صرت اس وقت ہوئی جبکہ ۲۳ جون ۱۹۴۷ء کو دفعتاً بعزت سڈیشن داخل حوالات ہونا پڑا۔

داخلہ جیل کو دنیا سے قطع تعلق کے برابر نہیں تو اس سے کچھ ہی کم سمجھنا چاہئے، ارباب ہوش کو اس سے موت کا سبق حاصل ہو سکتا ہے جس طرح سے کہ اجل انسان کو تمام دنیاوی جھگڑوں سے چھڑا کر آٹا فانا ایک ایسے عالم میں پہنچا دیتی ہے جس کا کسی کو علم نہیں، اسی طرح سے مقدمہ سڈیشن میں گرفتار ہونے والا اپنے تمام مشاغل اور کاروبار سے دفعتاً علیحدہ ہو کر ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں کی آب و ہوا طریق بود وماند طرز رفتار و گفتار غرضکہ ہر چیز نرالی نظر آتی ہے۔ فرق صرف اس قدر سمجھ لیجئے کہ موت کے بعد اعدا و اقربا سے دائمی جدائی ہو جاتی ہے لیکن یہاں آئندہ کے لئے امید باقی رہنے کے علاوہ انتقام مقدمہ تک کبھی کبھی ان سے دور کی ملاقات بھی ہو جاتا ہے۔

گرفتاری کے وقت راقم حروف کی شیرخوار لڑکی نعیمہ حد درجہ علییل تھی اور اتفاق سے مکان پر والدہ نعیمہ اور ایک خادمہ کے سوا اور کوئی موجود نہ تھا لیکن ان کی ذات سے اس ٹانگ وقت میں ہر بنائے سیادت و تائید ربانی حیرت انگیز حوصلہ و استقلال کا اظہار ہوا۔ خود پریشانی ہو کر راقم کو بھی مغموم کرنے کے بجائے انھوں نے دوسرے ہی دن بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ایسا ہمت افزا خط بھیجا جسے دیکھ کر جلد کار پردازان زندان متحیر رہ گئے راقم کا دل بفضلہ امر حق کی پیروی کے باعث یوں ہی قوی ہوتا لیکن ان کی اس تحریر کو ”تم پر جو افتاد پڑی ہے اسے مردانہ وار برداشت کرو۔ میرا یا گھر کا مطلق خیال نہ کرنا۔ خبردار تم سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار نہ ہو“ تقویت مزید کا باعث ہوئی۔ سہائی صاحب کو انھوں نے تار دیکر بلوایا تھا جن کے ہمراہ وہ جیل میں مجھ سے ملنے بھی آئیں اور جب تک مقدمہ چلتا رہا ہر ہفتہ آیا کیس اور آخر تک ان کی جرأت و ہمت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔

فالحمد للہ۔ ختم مقدمہ تک اخبار دیکھنے کی اجازت مجسٹریٹ علی گڑھ سے مل گئی تھی، اس لئے جن جن اخباروں کی نسبت میری پسند کا انھیں علم تھا وہ روزانہ بھیج دیا کرتی تھیں۔ دو ہی روز کے بعد مسٹر تلک کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا جس کے افسوس میں راقم کو اپنی تمام مصیبتیں فراموش ہو گئیں۔ مسٹر تلک کے ڈیفنس ایڈریس کو پڑھ کر البتہ روح تازہ اور ہمت بلند ہوتی تھی اور مجھ کو تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ایڈریس کی سماعت کے بعد اگرچہ انصاف سے کام لے گا تو مسٹر تلک ضرور بری ہو جائیں گے۔ لیکن جسٹس داور کے فیصلہ نے ان ساری امیدوں کا خون کر دیا۔ اس کبیدگی خاطر کے دوران میں ایک رباعی ذہن میں آئی تھی وہ مذر ناظرین ہے:-

طاعت ہے فرنگیوں کی جن کا دستور کیا خاک آنھیں داد گری کا ہو شعور
انصاف کے دشمنوں کا داور ہے لقب برعکس نہند نام زندگی کا نور

(۲)

حوالات میں داخل ہونے پر نو گرفتاران زندان کو سب سے زیادہ افسوس ناک نظارہ حوالاتیوں کی حالت زار کا نظر آتا ہے کہ ادنیٰ ملازمان جیل ناچایہ حصول زر کی غرض سے ان کی تذلیل کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بہت سے لوگ ان میں ناگردہ گناہ پولیس کا شکار اور پہلے ہی سے مظلوم ہوتے ہیں، ان کے ساتھ سنگدلی کا یہ قابل نفرت برتاؤ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قواعد جیل کی رو سے حوالاتیوں سے کچھ کام نہیں لیا جاسکتا لیکن علی گڑھ جیل میں تو ہم نے جب دیکھا کسی کو گھاس چھیلے کسی کو جھاڑو دیتے یا کچھ نہیں تو پانی ہی بھرتے پایا کیونکہ ان خدمات سے انکار کا نتیجہ زدو کوب کی ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگوں پر بلا ثبوت کافی محض اس لئے مقدمے قائم تھے کہ انھیں سزا نہ بھی ہوگی تو کم از کم حوالات میں رہ کر ان کی آہر تو خاک میں مل جائے گی۔

ایسے لوگوں کے مقدمات کو اہل پولیس ملتوی کراتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حوالات کی زندگی سے تنگ آجاتے اور بری ہونے پر بھو ایک طرح سے کافی سزا برداشت کر چکے ہیں۔ ہم سے ایک نوجوان حوالاتی نے بقسم بیان کیا کہ پولیس نے مجھے ازراہ عداوت ڈیڑھ مہینے سے حوالات میں بند کر رکھا ہے اور دوران مقدمہ میں علانیہ مجھے سنا سنا کر کہا کرتے ہیں کہ ”بچا اب چھوٹ بھی جاؤ گے تو کیا تم سے سزا سے زیادہ تو ہم نے حوالات میں تکلیف بھگتوالی“ یکساں طور پر مبتلائے مصیبت ہونے کی وجہ سے تمام حوالاتیوں میں باہم ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے ان میں سے اکثر اکیڈمر سے اپنی داستان الم بیان کر کے طالب ہمدردی تسکین ہوتے ہیں راقم حروف کا زمانہ حوالات اس قسم کے افسانوں کی سماعت میں صرف ہوا۔

اس بات کو جیل خانہ کے خصوصیات میں سے سمجھنا چاہئے کہ وہاں معاملات کی اصلیت قیدیوں یا حوالاتیوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور مقدمات کے تقریباً کل واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جیل میں داخل ہونے یا قید ہو جانے کے بعد پھر کوئی مجرم اپنے رازوں کو دوسرے قیدیوں یا حوالاتیوں سے چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ ہم نے عادی مجرموں کے سوا باقی اور سب قیدیوں کو عموماً سچ ہی بیان کرتے پایا۔ اب اگر ان لوگوں کے بیان صحیح تھے اور بظاہر ان کے درست نہ ہونے کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا تو ہم کہہ سکتے ہیں اہل پولیس کی رشوت ستانی و جبر نیز بعض اختیار لوگوں کی بے انصافی اور ناخدا ترسی اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ اگر لوگوں کو اس کی اصلی کیفیت معلوم ہو تو انکی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ہم ان تمام واقعات کی صحت کی باضابطہ طور پر ثابث نہیں کر سکتے ورنہ ان کے

اظہار سے باز نہ رہتے۔

ان تمام واقعات کو سن کر راقم حروف کو اپنی گرفتاری میں بھی مصلحت ایزدی کا ایک عجیب و غریب کوشش نظر آتا تھا کہ اسی کی بدولت اہل پولیس و بعض حکام کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دیکھنے اور ان کی تمام پوشیدہ کارروائیوں کے معلوم کرنے کا موقع حاصل ہوا۔

(۳)

تقریباً چالیس روز کی کشمکش اور بیکار طوالت کے بعد آخر کار مقدمے کا وہی فیصلہ ہوا جو اس قسم کے مقدمات میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے یعنی ۳۱ اگست ۱۹۵۲ء سے قید سخت کا آغاز اس طور پر ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ، جاکٹیا اور ایک کرتا ٹوپی پہننے کے لئے، ایک ٹکڑا ٹاٹ اور ایک کمبل بچھانے اور بٹھانے کے واسطے اور ایک قدح آمبی بڑا ایک چھوٹا دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا۔

ان چند چیزوں کے سوا قیدیوں کو اور کوئی شے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ابتدا میں سامان بود و ماند کی اس تفصیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن بہت جلد طبیعت نے انھیں کے استعمال پر قانع ہو کر ایک عجیب و غریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کر دے تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ بھی اتنی آسانی سے فراہم ہو سکتی ہیں کہ بظاہر ان کے لئے انسان کو جبر و ستم یا مکرو فریب کے وسایل اختیار کرنے اور بعض اوقات اختیار کی بنا کی و غلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔ زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان ہر طرح سے راقم حروف کو مناسب حال تھی البتہ ابتدا میں بحالت نیم برہنہ فریضہ نماز کے ادا کرنے میں تکلف ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنادیا۔ جیل کی سخت ترین مشقت ”چکی“ سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق ”برسرِ اولاد آدم ہرچہ آید بگزرد“ اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سنٹرل جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔ چنانچہ جب ۱۳ اگست کو دفعتاً تبادلہ آباد کی خبر معلوم ہوئی تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اُس جیل میں گورنمنٹ برانچ پولیس اور جیل پولیس کی موجودگی سے عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ قیدیوں کا وہاں بھیجا جانا اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان سے لکھنے ہی پڑھنے کی کوئی خدمت لیجائے گی لیکن راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے کسی رعایت کی امید نہ تھی۔ چنانچہ بعد میں ثابت ہوا کہ میرا خیال بالکل صحیح تھا اور الہ آباد جیل میں صرف یہی نہیں ہوا کہ بجائے کار تحریر راقم کو چکی ہی کی خدمت سپرد ہوئی بلکہ قید کی تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سرد کار رہا حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک یا دو ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

(۴)

روانگی الہ آباد کے لئے علیگڑھ جیل سے اسٹیشن تک دو پولیس مینوں کے ہمراہ پا بجولائی بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ روانگی ترین کا وقت قریب تھا لیکن سلاخ دار بیڑیوں کی سختی مانع رفتار تھی، علاوہ بریں آسمان کو ہجوم ابر نے غریب اور زمین کو خفیف ترشح نے نم کر دیا تھا۔ کچھ دور پا پیادہ چلنے کے بعد ہمراہی ملازمان پولیس نے حسب معمول اندر وے قانون بیگار

ایک اکا گرفتار کیا اور ہم سب اس پر سواری ہو کر اسٹیشن پہنچے۔ واضح ہو کہ گورنمنٹ نے ہمارے اخراجات سفر کے لئے کوئی ریل کے سوا ایک پیسہ زائد نہیں دیا تھا۔ یہاں تک کہ راستے میں قیدیوں کی خوراک کے لئے ارنی کس فی روز کے حساب سے جو رقم ملتی ہے وہ بھی نہیں دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے چنوں کے سوا اور کچھ کھانے کو نہ ملا۔

اور کسی کو تو راقم حروف کی روانگی علی گڑھ سے اطلاع نہ تھی البتہ ریلوے اسٹیشن کے ملازموں میں سے جو چند لوگ واقع حال تھے وہ گرد جمع ہو گئے اور افسوس کرتے رہے تین بجے سہ پہر کو ٹرین علی گڑھ سے روانہ ہو کر قریب شام ٹوٹنے پہنچی، جہاں اتفاق سے انڈین ڈیلی ٹیلیگراف کا ایک پرچہ دستیاب ہو گیا۔ دس بارہ روز سے چونکہ کوئی اخبار دیکھنے کو نہ ملا تھا اس لئے اس کا ایک ایک حرف بڑے شوق اور اضطراب کے ساتھ پڑھا۔ ٹرکی میں دستوری حکومت کے قائم ہونے کا حال معلوم کر کے مسرت بے اندازہ حاصل ہوئی اس روز کے بعد سے پھر آخر مدت قید تک اور کسی اخبار کی صورت تک نظر نہ آئی اور حق یہ ہے جیل میں یہی ایک تکلیف ایسی تھی جسے راقم نے سب سے زیادہ محسوس کیا۔

زمانہ حالات کے آئے ہوئے اخباروں، کتابوں اور کپڑوں کی ایک گٹھری بھی ہمراہ تھی۔ اٹھائے راہ میں آخری بار دیوان حافظ کی زیارت نصیب ہوئی۔ حافظ کی غزلیں ارباب ذوق و محبت کے لئے ہر حالت میں سرمایہ سرور ثابت ہوتی ہیں چنانچہ اس فقیر کے قلب مضطرب بھی باوجود بے اطمینانی ان سے بہت کچھ تسکین حاصل کی۔ ایک غزل نے خصوصیت کے ساتھ دل پر اثر کیا۔ اس قدر کہ راقم حروف نے اسے زبانی یاد کر لیا اور دوران قید میں بحالت تنہائی بار بار اسے دہرایا اور ہر بار نیا لطف پایا۔ ملاحظہ ہو:-

خیزتا از درمیانہ کشادے طلبیم	بر در دوست نشینم و مرادے طلبیم
لذت داغ غمت بر دل مابا و حرام	اگر از جو غم عشق تو دادے طلبیم
زاد راہ حرم دوست نداریم مگر	بگدائی ز در میکدہ زادے طلبیم
چوں غمت را نتوان یافت مگر در دل شاد	مابا مید غمت خاطر شادے طلبیم
بر در مدرسہ تاجند نشینی حافظ	خیزتا از درمیانہ کشادے طلبیم

ٹوٹنے میں چند نوجوان لوگوں کو شاید راقم کا حال معلوم ہو گیا تھا کیونکہ جب ٹرین وہاں سے چلی تو انہوں نے پلیٹ فارم کے آخری حصے کے قریب جمع ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ با چشم پر غم سلام کیا۔

کان پور میں ایک صاحب نے اگر دریافت کیا کہ غالباً آپ اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر حضرت مولانی ہیں اور جواب ثبات میں پاکر کچھ دیر ہمدردانہ باتیں کرتے رہے انھیں بھی الہ آباد جانا تھا اس لئے راستے میں ان سے کئی بار ملتا ہوا۔ والد مرحوم کی نسبت مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اپیل کی غرض سے الہ آباد ہی میں ہوں گے اس لئے میں نے انھیں صاحب کے ذریعہ سے اپنے تبادلہ الہ آباد کی اطلاع اور سنٹرل جیل میں ملجانے کی درخواست کر دی تھی۔ والد مرحوم کے جائے قیام سے مجھ کو آگاہی نہ تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے انھیں بکوشش تلاش کر کے میرا پیام اس روز پہنچا دیا۔ کیونکہ دو ہی چار روز کے بعد معلوم ہوا کہ والد مرحوم نے مجھ سے ملنے کی درخواست پیش کی ہے لیکن افسوس کہ سپرنٹنڈنٹ جیل نے ان کی درخواست کو کسی مصلحت سے منظور نہیں کیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ مجھ کو اس واقعہ کا کسی قدر افسوس ہوا خصوصاً اس لئے کہ اپیل کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو رہی تھی اس کا کچھ بھی حال معلوم نہ ہو سکا۔

والد مرحوم کو میرے اس طرح پر گرفتار مصیبت ہونے کا بے انتہا قلق تھا۔ چنانچہ جیل سے واپس آنے پر اکثر احوال کی زبانی معلوم ہوا کہ اس واقعے کے بعد ان کی صحت کبھی صحیح نہیں رہی اور آخر کار میری عدم موجودگی ہی میں انھوں نے انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیل میں مجھ کو اس واقعے کی خبر تک نہیں ہوئی۔ الہ آباد کا سنٹرل جنرل مینی میں ہے جہاں جانے کے لئے الہ آباد سے آگے نینی جنکشن پر اترنا ہوتا ہے ہم لوگ صبح کو وہاں پہنچ کر آٹھ بجے کے قریب سنٹرل جیل میں داخل ہوئے۔ علی گڑھ جیل کے کپڑے اتار لئے گئے اور کہا گیا کہ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے اس وقت تک کالے کپڑے پہنوجن کی کیفیت یہ تھی کہ ان سے زیادہ کثیف غلیظ اور بدبو دار کپڑوں کا تصور انسانی ذہن میں نہیں آسکتا۔ لیکن قہر درویش سبحان درویش وہی کپڑے پہننا پڑے۔ راقم حروف کی نگاہ دور بین نہیں ہے اس لئے پڑھنے لکھنے کے اوقات کو چھوڑ کر باقی ہر وقت عینک کی ضرورت رہتی ہے۔ چنانچہ علی گڑھ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے بعد معائنہ عینک لگائے رہنے کی اجازت دیدی تھی لیکن الہ آباد والوں نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور عینک کو داخل دفتر کر کے راقم کی بے دست پائی کو ایک درجہ اور بڑھا دیا۔ اینہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر۔

تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں اور کاغذوں کو باشتائے دیوان حافظ اپنے سامنے جلو کر خاکستر کر دیا اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے اور وہاں مار کر خاک کر دئے جاؤ گے۔ اس خطاب پر عقاب کا خاموشی کے سوا اور جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔ جیلر صاحب نے غالباً یہ تقریر محض دھمکانے کی نیت سے کی ہوگی کیونکہ بعد میں ان سے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قیدیوں کی نسبت جیل خانے کی یہ مشہور مثل بالکل صحیح ہے کہ ”مر جائیں تو نکلیں اور نکل جائیں تو شیر“ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قیدی جیل میں مر جائے تو وہاں اس واقعے کی اہمیت ایک مکھی کے مرجانے سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی لیکن اگر کوئی قیدی وہاں سے نکل بھاگے میں کامیاب ہو جائے تو یہ واقعہ اسی قدر اہم شمار کیا جائے گا جتنا ایک شیر کا کٹہرے سے نکل جانا۔

حاضری دفتر کی زحمت سے نجات حاصل ہونے پر سفری بیڑیاں کٹوانے اور وزن درج رجسٹر کرانے کی غرض سے روز گزشتہ سے اس وقت تک کے آئے ہوئے نئے قیدیوں کی قطار میں بیٹھنا پڑا۔ سوامی شوانند سے اول اول اسی مقام پر ملاقات ہوئی کیونکہ وہ بھی ایک جدید قیدی کی حیثیت سے کالے کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔

مذکورہ بالا ضروری کارروائیوں کے بعد ہم (یعنی راقم حروف و سوامی جی) حسب قاعدہ مقررہ تا معائنہ ثانی پُرانی ”تکلیف“ بھیج دئے گئے جہاں کہ دس بارہ روز قیام کی کیفیت ابھمن تذکرہ سوامی جی مجملہ درج اردو کے معنی ہو چکی ہے۔ واضح ہو کہ الہ آباد سنٹرل جیل کے چار خاص حصے ایک ہی چہار دیواری کے اندر لیکن علیحدہ علیحدہ بنے ہیں اول نئی تکلیف جس میں زیادہ تر کمسن نوجوان یا وہ قیدی رکھے جاتے ہیں جو گورنمنٹ برانچ پریس میں کام کرتے ہیں۔ دوم پُرانی تکلیف جس میں عارضی طور پر نئے آئے ہوئے قیدی یا جنگجو و شورہ پشت لوگوں کے سوا کوٹھریوں میں قید تنہائی بسر کرنے کے لئے تمام جیل سے ہر مہینے کچھ قیدی آتے جاتے رہتے ہیں پُرانی اور نئی تکلیف میں بارکوں کی وضع یہ ہے کہ ہر ایک بارک میں دو روپہ کوٹھریاں بنی ہیں اور درمیان میں ایک کھلا ہوا احاطہ ہے۔ جسے جیل کی زبان میں اڑ گڑا کہتے ہیں۔ یہاں قیدیوں کے نہانے دھونے پاخانے وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔

باقی رہے دو احاطے ایک نیا احاطہ جس میں زیادہ تر دو تین یا زیادہ مرتبہ کے سزا یافتہ قیدی رکھے جاتے ہیں۔

دوسرا پرانا احاطہ اس میں زیادہ تر یکبارہ قیدی رہتے ہیں۔ ان دونوں احاطوں کی بارکوں میں کوٹھڑیاں نہیں ہیں بلکہ ہر بارک میں دو رویہ برابر برابر ۴۰ یا ۴۵ مٹی کے چوتھے قیدیوں کے لیٹنے کے واسطے بنادئے گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رات کو جو پالیس پچاس قیدی ایک بارک میں بند ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر فرصت کے وقت بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔

(۵)

”نئی تکلیف“ جیلر کے تحت میں رہتی ہے پُرانے اور نئے احاطوں کے لئے علیحدہ علیحدہ یو بی پی نائب جیلر اور وارڈ اور پرائی تکلیف کے واسطے عموماً ایک ہندوستانی وارڈ مقرر ہوتا ہے۔ جیل میں ان مختلف حصوں کی اچھائی بُرائی کا اندازہ وہاں کے حکام کی اچھائی بُرائی سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے زمانہ میں جیلر نیر یورپین اور ہندوستانی وارڈ رینک مشہور تھے اس لئے نئے احاطے نیر نئی اور پرائی تکلیف کو قیدی غنیمت شمار کرتے تھے لیکن نائب جیلر کی سختی کا ہر شخص شاک تھا۔ چنانچہ اسی باعث سے پُرانے احاطے کے نام سے قیدی خون کھاتے تھے۔ وہاں کی سختیوں کے قصے روز قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے لیکن نہ معلوم تھا کہ چند ہی دن میں ہم کو اسی احاطے میں جانا اور پھر وہیں تمام زمانہ قید بسر کرنا پڑے گا۔

اب ہر ایک بارک کا انتظام سنئے کہ ان تیس چالیس قیدیوں میں سے جو ایک بارک میں بند کئے جاتے ہیں کم از کم تین برقعہ دار قیدی نمبر دار یا نگراں کار، کم از کم چھ پہرے والے اور باقی معمولی قیدی ہوتے ہیں ہر پہرے والا رات کو دو گھنٹے پہرا دیتا ہے جس کا طریق یہ ہے کہ ایک سرے سے تمام قیدیوں کو شمار کر لینے کے بعد شمار کنندہ آخر میں خود کو بھی شمار کر کے بارک کے مقفل دروازے کے قریب آکر آواز بلند رپورٹ دیتا ہے مثلاً ۲۰ قیدی بارک نمبر ۵ میں بند ہوں تو پہرے والا یوں کہے گا:۔ ایک دو تین چار۔۔۔۔۔ سترہ اٹھارہ انیس ہم بیس ہیں قیدی ٹھیک ہیں صاحب۔ تالا جنگلا سب ٹھیک ہے پانچ نمبر رات کو چار پانچ بار ملا زمان جیل کی روند آتی ہے اس وقت پہرے دار کی جگہ برقعہ دار رپورٹ دیتا ہے کیونکہ رات بھر کے لئے بارک کے اندر ہر قسم کی جوابدہی برقعہ داروں ہی کے ذمے ہوتی ہے اس ذمہ داری کے عوض میں قیدیوں پر ان کو اختیار بھی کچھ حاصل ہوتا ہے چنانچہ جس طرح جیل کے مختلف احاطوں کی اچھائی یا بُرائی کا دارو مدار وہاں کے حاکموں کی نیکی یا بدی پر ہوتا ہے اسی طرح سے احاطے کے اندر بارکوں کا پسندیدہ یا نا پسندیدہ ہونا برقعہ داروں کی نیکی یا بدی پر ہوا کرتا ہے۔

پرائی تکلیف میں ہماری اور سوامی جی کی بارک کے سب برقعہ دار نیک پڑھے لکھے اور ہم لوگوں پر خاص کر مہربان تھے۔ ضلع فرنچ آباد کے منشی جہتمن لال قیدیوں کے کپڑوں اور طوق گلو کی تختیوں پر نمبر ڈالنے کی خدمت پر متعین تھے۔ ضلع فیض آباد کے منشی نول بہاری لال غلہ گودام میں منشی تھے اور ضلع بریلی کے داروغہ مزین داس پرائی تکلیف کے محرر تھے۔ برقعہ داروں کو پوشاک عام قیدیوں سے بہتر ملتی ہے۔ خوراک میں قاعدے کی رو سے تو کچھ فرق ہوتا نہیں لیکن نسبتاً صاحب اختیار ہونے کے سب سے وہ لوگ بطور خود بہتر خوراک کا انتظام کر سکتے ہیں۔ انھیں کاغذ پنسل رکھنے کی بھی اجازت ہے اور وہ بہ ضرورت احاطہ جیل کے اندر جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔ سوامی جی کو داروغہ صاحب روز صبح گیسوں کا دلیا شکا دیتے تھے اور شام کو ہم دونوں کے لئے صاف روٹیاں اور ترکاری بہم پہنچاتے تھے بلکہ سوامی جی اور داروغہ صاحب کی خاطر سے دوسری بارکوں کے برقعہ دار بھی جب کبھی خفیہ طور پر کوئی غیر معمولی چیز کپواتے تھے تو ہم لوگوں کا بھی حصہ لگایا جاتا تھا۔ سوامی جی کے ذمے بان بٹنے کا کام تھا اس لئے انھیں کہیں جانا نہ پڑتا تھا لیکن راتم حروٹ کو چکی پیسنے کی غرض سے پُرانے یا نئے احاطے میں جانا ضروری تھا، نئے احاطے میں دوبارہ قیدی چکی پیتے ہیں اس لئے وہاں عموماً آٹا موٹا پیسا جاتا ہے اور ان سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا کیونکہ وہ لوگ بیباک اور مار دھاڑ سے بالکل بیخوف ہوتے ہیں، اس کے برعکس پُرانے احاطے میں یکبارہ قیدی

مداخلت جیل سے ناواقف اور ملازموں کی زد و کوب و سب و شتم سے ہر وقت خائف رہتے ہیں اسی لئے ان سے آٹا بہت باریک پسوایا جاتا ہے۔

داروغہ صاحب نے پہلے روز راقم کو نئے احاطے کو بھجوا دیا۔ نئے احاطے کا دارڈ نیک تھا اس لئے چکی خانے کے برقنداز اور دفعدار نے راقم پر کوئی خاص سختی نہ کی بلکہ داروغہ کی سفارش سے رعایت ہی کا مستحق سمجھا۔ لیکن دوسرے ہی روز نائب جیلر کا حکم آگیا کہ علی گڑھ والے قیدی کو پُرانے احاطے بھیج دو۔ اور وہ چکی پینے نئے احاطے میں نہ جانے پائے۔ قریب شام جب ہم نئے احاطے سے کام کر کے پُرانی تکلیف حسب معمول اپنی اپنی بارک میں بند ہونے کے لئے آئے تو داروغہ صاحب اور سوامی جی کو خاموش اور رنجیدہ پایا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی وقت مجھ کو پُرانے احاطے میں جانا اور سوامی جی سے جدا ہونا ہو گا۔ داروغہ صاحب نے سوامی جی کی فرمائش سے راقم حروف کی آخری دعوت کے لئے کچھ پوریاں اور کچھ حلوا تیار کر رکھا تھا۔ سوامی جی نے مجھے علیحدہ لے جا کر خود کھلایا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں بغلگیر ہو کر بغایت افسوس و افسردگی ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ ابتدائی مقدمہ اُردوئے معلے سے اُس وقت تک بہت سے افسوسناک مناظر پیش نظر ہوئے تھے لیکن مجھ کو خوب یاد ہو کہ کسی موقع پر میرے آنسو نہیں نکلے۔ لیکن اس وقت سوامی جی کو مضطر اور آبدیدہ دیکھ کر مجھے بھی ضبط نہ ہو سکا اور دیر تک باوجود ضبط آنکھیں پرغم رہیں۔ پُرانی تکلیف سے رخصت ہو کر پُرانے احاطے میں اس وقت پہونچنا ہوا کہ بارکیں بند ہو رہی تھیں۔ نائب جیلر جن کے تحت میں وہ احاطہ تھا۔ اس وقت پانچ نمبر کو بند کر رہے تھے۔ دفعدار نے مجھ کو لپکا کر وہیں پیش کیا میں کچھ مشورہ کرنے کے بعد یہ حکم ہوا کہ اس کو پانچ نمبر میں نہیں بلکہ سات نمبر کے پچھلے حصے میں بند کرو۔ پانچ نمبر کے برقنداز ضلع مظفر پور کے ایک قلعیم یافتہ مسلمان تھے۔ ان سے بعد میں مشورت کی حقیقت دریافت ہوئی کہ سات نمبر کا برقنداز چونکہ تمام احاطے میں بد زبان اور سختگیر مشہور تھا۔ اس لئے میرا اسی نمبر میں رکھا جانا مناسب سمجھا گیا۔ سات نمبر کے قیدیوں کو پہلے ہی سے یہ حکم سنا دیا گیا تھا کہ نئے آئے ہوئے قیدی سے نہ کوئی ملے اور نہ بات کرے اور برقنداز کو یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس شخص کے دماغ کی گرمی نکال دو۔

پُرانا احاطہ تمام جیل میں تشدد اور سختی کے لئے بدنام تھا۔ پھر اس احاطہ میں سات نمبر کے برقنداز کی سختی و بدزبانی بھی مشہور عام تھی۔ ان سب پر طرہ مزید سختی اور نگرانی کے خفیہ احکام تھے۔ جن کو سن سن کر میرے لئے لوگ بہت متفکر تھے لیکن بمصدق ”دشمن اگر قوی است نگہباں قوی ترست“ جن لوگوں سے بدی کی توقع تھی انھیں نے راقم حروف کے ساتھ نیکی اور مروت کا برتاؤ کیا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا

(۶)

بارک نمبر کے تمام قیدیوں اور برقندازوں کو راقم کے متعلق پہلے ہی سے خفیہ احکام پہونچ چکے تھے کہ نئے قیدی سے نہ کوئی ملے نہ بات کرے۔ ڈاکٹر برقنداز بارک نے جو اپنی سختی اور بدزبانی کے لئے تمام جیل میں بدنام تھا مزید احتیاط کی غرض سے راقم کا بستر عین اپنی نشست کے سامنے لگوا دیا تاکہ ہر وقت کافی نگرانی آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ لیکن بمصدق ”الانسان حرص علی ما منع“ اس روک ٹوک سے قیدیوں کے دل میں مجھ سے ملنے اور بات چیت کر کے دریافت حال کرنے کا اور بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ دن کو تو ڈاکٹر کے خون سے کوئی بول نہ سکتا تھا۔ لیکن رات کو جب سب سو جاتے تھے تو ضلع شاہجہانپور کے پنڈت ملک رام پیرے والے اپنے ہر گشت میں کچھ دیر میرے قریب ٹھہر کر ضرور مصروف گفتگو ہوتے تھے۔ اس درجہ ذہین تھے کہ تھوڑی ہی دیر کی گفتگو میں انھوں نے کل معاملات کو بخوبی سمجھ لیا کہ اخبار کسے کہتے ہیں اور سڈیشن کس شے کا نام ہے۔ سڈیشی اور لوائیکاٹ سے وہ پہلے ہی سے واقف تھے قومی تعلیم اور پنچایت کے اصول کو بھی انھوں نے بلا تکلف معلوم کر لیا۔ اور

دوسرے ہی تیسرے روز انھیں تلک جہا راج کے ذریعے سے تمام بارک والوں کو میرے معاملے کی خبر ہو گئی اور پھر بارک سے نکل کر بہت جلد تمام احاطے میں مشہور ہو گئی۔ کیونکہ ہماری بارک کے قیدی قریب قریب تمام کارخانوں میں کام کرنے کے لئے جاتے تھے۔ حسن اتفاق کا یہ بھی کرشمہ قابل التفات ہے کہ مسٹر تلک کے ایک پیرو کو جیل میں بھی ہر جگہ پہلے پہل تلک ہی کے ہمنام کوگوں سے سابقہ پڑا۔ پُرانی تکلیف میں میرٹھ کے مشہور شہرہ پشت قیدی تلک سنگھ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور پُرانے احاطے میں ابتدائے کلام تلک رام سے ہوئی۔

تلک سنگھ کا حال سننے کے قابل ہے۔ یہ بزرگ چھبیس سال سے جیل میں سکونت رکھتے ہیں۔ درمیان میں کئی بار رہا ہوئے لیکن ہر مرتبہ چند ہی ماہ کے بعد دوبارہ کسی جرم کی علت میں خوشی خوشی اپنے مسکن میں پھر داخل ہو گئے۔ پنجاب اور صوبجات متحدہ کا کوئی سنٹرل جیل ایسا نہیں ہے جس کا حال انھیں ذاتی طور پر نہ معلوم ہو۔ جب کبھی یہ اپنے کارنامے بیان کرتے تھے تو تمام سامعین ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے۔

جیل میں آگ جلانے یا حقہ پینے کی سخت ممانعت ہے لیکن تلک سنگھ علانیہ آگ جلا کر حقہ پیتے تھے اور ملازمان جیل بھی تنگ ہو کر چشم پوشی کرتے تھے۔ جیل کی کوئی سزا ایسی نہیں ہے جو ان کو نہ ملی ہو۔ بیڑیاں ان کے پڑی تھیں۔ کوٹھری میں یہ بند رہتے تھے۔ کپڑوں کے عوض ٹاٹ انھیں پہننے کو ملا تھا۔ لیکن اسے بھی انھوں نے جلا دیا تھا اس لئے ایک لنگوٹ کے سوا اور کوئی کپڑا ان کے جسم پر نہ تھا۔ ٹاٹ کا بستر توڑ توڑ کمرے انھوں نے حقہ پی ڈالا تھا۔ اور دن تمام ہجرتوں کے بعد بھی اس درجہ بیباک تھے کہ جب کبھی جیلر یا کسی دوسرے افسر کا ان کی جانب گزر ہوتا تھا تو اس سے تیل اور گڑ کی فرمایش ضرور کرتے تھے اور کبھی کبھی پا بھی جاتے تھے۔ راقم کے حال پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ اپنے پاس بٹھا کر جیل کے کل معاملات کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ سمجھا دیا تھا کہ اتنی معلومات ساہا سال کے تجربے سے بھی بمشکل حاصل ہوتی ہاں بٹتے تو زیادہ نہ تھے، لیکن برقنداز سے کبھی سات آٹھ سو گز سے کم نہ لکھواتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ مقررہ (۳۰۰) گز سے ہمیشہ چار یا پانچ سو گز زیادہ کام کرنے کے صلے میں آٹھ یا دس نشان روز انھیں ملا کرتے تھے اور چوبیس نشانوں کی ایک دن کے حساب سے ہر ماہ دس یا بارہ روز رہائی کے مستحق ٹھہرتے تھے۔

سلسلہ بیان کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل میں برقنداز ذکر کا مذکور تھا کہ انھیں راقم حروف کی سخت نگرانی کا حکم تھا اور عجب نہیں کہ درپردہ غیر معمولی سختی کرنے کا بھی اشارہ کیا گیا ہو۔ راقم ان تمام معاملات سے آگاہ تھا لیکن انے یقیناً بے پروا اکثر فکر و تصور کے دوسرے ہی عالم میں رہا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے قریب اسی عنوان سے گزر گیا کہ میں کسی سے بولا نہ ڈاکر کو مجھ سے بات کرنے کی نوبت آئی۔ باندے کے کریم پہلو ان کا بستر میرے بستر سے بالکل متصل ہوتا تھا وہ البتہ کبھی کبھی شب کو اپنی سرگزشت سنایا کرتے تھے کہ پولیس نے انھیں بے قصور ڈاکو ثابت کر کے پانچ سال کیلئے قید کر دیا۔ واللہ اعلم

غازی آباد کے ایک نوجوان عبداللہ نے بھی ابتدا ہی سے میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور شرافت کا برتاؤ کیا کہ جب کبھی موقع ملتا تھا وہ میری دلہی کی کوشش کیا کرتے تھے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ تھوڑے ہی دنوں میں رمضان المبارک کی آمد آمد سے مسلمان قیدیوں میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اسلامی اخوت کا جیسا زبردست اثر میں نے اس موقع پر زندانِ فرنگ میں محسوس کیا اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہمارے بارک میں جتنے مسلمان قیدی تھے تقریباً ان سب نے روزہ رکھنے اور سحر و افطار کے وقت یکجا ہو کر کھانا کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ جس سے بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اسلام کی شان مساوات و اخوت سادگی کے ایک عجیب و غریب عالم میں نمودار ہوتی

تھی جس کا اثر ہم سب کے حتیٰ کہ ڈاکٹر کے دل نے بھی قبول کیا۔ چنانچہ ایک روز وہ مجھ سے بلا تقریب مخاطب ہو کر بولے کہ ”سبحانی صاحب - میری جانب سے سختی کا خون آپ اپنے دل سے نکال دیجئے۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ میں کچھ نہ کر سکتا بلکہ آپ کو جس چیز کی ضرورت یا جو تکلیف ہو مجھ سے بے تکلف کہہ دیجئے گا۔“

ڈاکٹر کے اس غیر معمولی برتاؤ نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو اس کو محض بتاؤٹ سمجھتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا سچے دل سے کہا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد جب تک وہ بارک میں رہے روزانہ شام کو اپنے کارخانے سے انظار و سحر کے لئے مختلف قسم کی چیزیں پکا کر لاتے تھے اور سب کے ساتھ کھاتے تھے لیکن آٹھ ہی دس دن کے بعد وہ دفعتاً بیمار ہو کر اسپتال چلے گئے اور پھر وہیں سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کے پنجاہ سالہ جلی کی خوشی کے موقع پر رہا ہو گئے۔ جن لوگوں کی مشقت چکی خانہ میں تھی ان کو رمضان میں سب سے زیادہ دشواری پیش آئی کیونکہ جلد جلد پانی پینا چکی پیسنے کے لوازمات میں داخل ہے۔ علاوہ بریں بے کھائے پئے ایک من گہیوں پینا یوں بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ لیکن اکثر مسلمان بہادر وں نے باوجود ان تمام سختیوں کے روزہ ترک نہ کیا۔ رحمت الہی نے بھی ہم لوگوں کو فراموش نہیں کیا کیونکہ لوگ یہ دیکھ کر تعجب کرتے تھے کہ دن میں دس دس میں میں بار پانی پینے والے ایک بار بھی پانی پئے بغیر اتنی سخت محنت کس طرح سے کر لیتے تھے۔

الغرض ایک ایک دن کر کے ماہ رمضان بھی ختم ہونے کو آیا اور آخری جمعہ کو ضلع بجنور کے میر مظفر حسین صاحب فوق کی تحریک پر نماز ادا کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ راقم حروف نے زبانی خطبہ اور اسی وقت کے لکھے ہوئے چند الوداعی اشعار پڑھ کر نماز پڑھائی۔ دو ہی چار روز کے بعد عبدالقادر کی تقریب پیش آئی۔ لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ الہ آباد سنٹرل جیل میں عید کی تعطیل کا دستور تھا لیکن اتفاق سے کنگ ایڈورڈ آنجنہائی کا اعلان بابت معافی قید مجرمان تقریب جشن پنجاہ سالہ حکومت برطانیہ اسی روز حکام جیل کو ملا۔ جس نے عید کی خوشی کو دوبالا کرنے کے علاوہ تعطیل کو بھی لازمی کر دیا۔ جذبہ امید کی خوشگواہی اور فوری تاثیر کا جیسا دلچسپ سماں جیل خانوں میں نظر آتا ہے۔ اس کی مثال غالباً کہیں اور نہ مل سکے گی۔ جیل باز زبان عوام جلی کی خفیہ سے خفیہ خبر یا افواہ طرفہ العین میں تمام جیل میں مشہور ہو کر قیدیوں کے چہروں کو سرور امید سے منور کر دیتی ہے اور ہر شخص اپنی ربائی کے خیال سے کم از کم تھوڑی دیر کے لئے اپنے مصائب کو فراموش کر دیتا ہے۔

غازی آباد ضلع میرٹھ کے عبداللہ کا ذکر پہلے آچکا ہے اس نیک دل نوجوان نے بخلوص کامل میرے انکار اور ممانعت کی مطلق پروا نہ کر کے باصرار میری ایسی خدمت کی جس کا میں مدت العمر ممنون احسان رہوں گا۔ بلا تاغہ میرے کھانے پینے کے برتنوں کی صفائی میرے بستر کا بارک سے باہر نکالنا اور پھر اندر لے جانا۔ چکی خانے میں اپنا کام ختم کر کے میری مدد کو آنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ عید کے روز بھی معلوم نہیں کہاں سے چند لکڑیاں فراہم کر کے ایک گوشے میں چھپا کر میرے غسل کے لئے پانی گرم کیا اور کپڑے دھو کر صاف کر دئے۔

عید کے روز تھوڑی دیر کے لئے تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت ملتی ہے کہ وہ جیل اسپتال میں جمع ہو کر نماز پڑھ لیں۔ چنانچہ اس روز بھی پرانی تکلیف، نئی تکلیف اور نئے احاطے سے سب لوگ آئے تھے۔ لیکن ہمارے احاطے کے دائرہ نے اپنی معمولی سختی سے کام لے کر ہم لوگوں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ مجبوراً ہم ۶۰ - ۷۰ لوگوں کو علاوہ نماز پڑھنا پڑی نماز کے بعد لوگوں کے اصرار سے راقم حروف نے مختصر سا وعظ بھی کہا۔ جس میں تمام فرایض اسلام کی عموماً اور خریفینہ صوم کی خوبیاں خصوصاً حاضرین کے گوشگزار کی گئی تھیں۔

نماز عید کے بعد سارا دن جہلی کے تذکروں میں صرف ہوا۔ شاہ ادورڈ ہنٹم کا فرمان یہ تھا کہ ”تمام قیدیوں کی قید یا معاف کی جائے یا اس میں تخفیف ہو۔“ لیکن غالباً درمیانی لوگوں کی دراندازی کا انسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ معاف تو کسی کی بھی قید نہ ہوئی۔ البتہ فی سال ایک ماہ کے حساب سے رہائی کل قیدیوں کے ٹکٹوں پر چڑھا دی گئی مگر طرہ تماشاً یہ ہوا کہ تین ماہ کے بعد روزانہ دس بیس لوگوں کی جیلیاں خارج ہونا شروع ہوئیں۔ جس سے شاہی اعلان کی حد درجہ سبکی ہوئی۔ حقیقت حال سے ناواقف قیدی بیگناہ بادشاہ کو علانیہ برا بھلا کہتے تھے کہ دیکر کسی چیز کا واپس لینا کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہے بادشاہوں کا طریقہ نہیں ہے۔

اس رعایت سے پولیٹیکل قیدیوں کی محرومی کا قصہ ہم پہلے ہی دسج کر چکے ہیں مجھ کو بھی ایک روز مع ٹکٹ اپنے روبرو طلب کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ”تم کو جہلی نہیں ملے گا“ اور ۱۰ ماہ کی رہائی میرے ٹکٹ سے خارج کر دی میں نے ”عطائے تو بہ لقاے تو“ کہہ کر خاموشی اختیار کی۔ یہ پینتالیس دن تو گویا چشم زدن میں گزر گئے لیکن اہل فرنگ کی اس تنگ دلی کا افسانہ ہمیشہ کے لئے یاد رکھنا۔ ۶۔

(۶)

الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی کی مشقت سب سے زیادہ سخت ہے کیونکہ وہاں رام بانس یا ہاتھی چنگار کوٹنے کی مشقت موجود ہی نہیں ہے جو چکی سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہے اور جس کی نسبت ہر جیل میں یہ شہر قیدیوں کی زباں زد ہے کہ:-

جیل خانے کا برا رویہ کوئی کسی کا یار نہیں رام بانس کی کڑی مشقت چکی سے انکار نہیں

راقم حروف کے حال پر حکام جیل کی یہ خاص عنایت تھی کہ تقریباً تمام مدت قید اسی مشقت میں بسر ہوئی۔ قاعدہ کی رو سے فی قیدی ۱۵ سیر کے حساب سے دو قیدیوں کو ۳۰ سیر غلہ پینے کو ملنا چاہئے لیکن الہ آباد میں ۳۰ سیر کے بجائے ۴۰ سیر پسواتے ہیں جس کے عوض میں ہر سہ ماہی پر دو یا تین دن رہائی کے دئے جاتے ہیں بشرطیکہ اس عرصہ میں کوئی قصور ایسا نہ سرزد ہو جائے، جس سے پیشی کی نوبت آجائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ قیدی جب کوئی جیل کا جرم کرتا ہے تو اسے وارڈن سزا کے لئے سپرنٹنڈنٹ کے روبرو پیش کرتا ہے اسی کا اصطلاحی نام پیشی ہے جس کی عجیب و غریب روایتیں تقریباً ہر روز چکی خانے میں پیش آتی رہتی تھیں۔ اگر چالیس سیر غلہ کا آٹا ٹھیک چالیس سیر سے چھٹاٹک آدھ پاؤ بھی کم ہو جائے تو پیشی۔ اگر آٹا ذرا بھی موٹا رہ جائے تو پیشی۔ اگر آٹے میں ذرا بھی مٹی یا پانی ملائے جانے کا شبہ ہو تو پیشی۔ مٹی یا پانی ملائے

جانے کا معاملہ اس طور پر ہے کہ بعض قیدی کافی خوراک نہ پانے کے سبب سے مجبوراً کچا غلہ چبا جانے پر مجبور ہوتے ہیں اور بعد میں آٹا پورا کرنے کے لئے گیموں میں مٹی اور جوار یا چاولوں میں پانی ملا دیتے ہیں۔ جو لوگ نہیں کھاتے انہیں بھی کچھ نہ کچھ ملانا ضرور پڑتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ آٹا پینے کے دوران میں کچھ تو چکی میں رہ جاتا ہے اور کچھ اڑ کر ہوا میں لمبھاتا ہے کچھ پینے والوں کے بدن پر پینے کے ساتھ جم جاتا ہے۔ داروغہ صاحب علانیہ فرماتے تھے کہ جو چاہو کرو ہم کو آٹا پورا دو۔ ورنہ ہم پیشی کر دیں گے۔ چنانچہ چکی خانے کا برقدار بھی ڈر کے مارے خود ہی قیدیوں کو مٹی چھپا کر لے آنے کی اجازت دیدیتا تھا۔ ایک روز ایک قیدی کی برقدار سے اس بنا پر کچھ جھج ہو گئی تھی کہ برقدار نے اسے غلہ چرا کر نہ لیجانے دیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیدی نے دفعدار کو بلایا اور کہا کہ برقدار پانی ملواتا ہے۔ قسمت کی خوبی دیکھئے کہ سب سے پہلی چکی میری ہی تھی جس کے پاس ہی میرا ساتھی بقدر ضرورت یعنی قریب آدھ پاؤ یا پون پاؤ کے پانی ملا رہا تھا۔ مجھ کو اس واقع کی خبر نہ تھی کیونکہ عام طور پر میں روزانہ غلہ پینے کے بعد چکیوں کے جانب پشت جا کر زمین پر لیٹ رہا کرتا تھا اور آٹے کا جھاڑنا اور پٹی میں بھرنا وغیرہ

اپنے ساتھی ہی پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ ہنگامہ برپا ہونے پر میں نے بھی دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرا ساتھی گرفتار ہے اس کے پاس یا میرے پاس کچھ پیسے دفعتاً کو دینے کے لئے ہوتے تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ لیکن چونکہ ہم دونوں نادار تھے اس لئے پیشی ہوئی اور کچا غلہ کھانے کے الزام میں تین دن رہائی ضبط ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی مسکراہٹ سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں میری نسبت غلہ کھانے کا گمان نہیں ہے لیکن اصول جیل کے مطابق کسی ماتحت کے پیش کرنے پر سزا کا دینا لازمی تھا ورنہ اس کی سبکی ہوتی۔ میرے متعلق پیشی کا یہ دوسرا واقعہ تھا پہلا واقعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ چکیاں عموماً اس قدر وزنی ہوتی ہیں کہ ایک شخص کو ان کے اوپر کا پاٹ اٹھانا بھی مشکل ہوتا ہے اس لئے دو شخص ایک چکی پر آنے سامنے کھڑے ہو کر پیتے ہیں اور اگر برابر پیسے جائیں تو صبح چھ بجے سے لیٹرسہ پہر کے تین بجے تک غلہ پس جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دونوں پینے والے برابر زور لگائیں۔ میری نسبت وارڈر کو یہ گمان تھا کہ اس سے چکی نہ پس سکے گی جب دوسرے دن برقنداز سے دریافت کرنے پر اُس نے معلوم کیا کہ میں نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا تو اسے یقین نہ آیا اور برقنداز سے ایسی باتیں کیں جن سے اس نے اپنی سمجھ کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ میری نسبت وارڈر کا نمشا یہ ہے کہ اس کی پیشی ہو جائے، چنانچہ تیسرے دن اس نے مجھے سب سے خراب چکی دی اور میرے جوڈیار کو سمجھا دیا کہ تم ڈھیل دیدینا تمھیں ہم پیشی پر نہ بھیجیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دس سیر غلہ باقی رہ گیا۔ قاعدے کے مطابق ہم دونوں کی پیشی ہونا چاہئے تھی لیکن حسب قرار داد سابق صرف میری پیشی ہوئی اور دو دن کے لئے رات کو ہتھکڑیاں ڈالنے کی سزا تجویز ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ سے سب حال کہہ دوں لیکن برقنداز کو پیٹی اتار کر زد و کوب پر آمادہ پا کر میں نے خاموشی اختیار کی اور معاملے کو خدا کے سپرد کیا۔

(۸)

صبح سے شام تک چکی پینا بجائے خود ایک سخت مشکل کام تھا لیکن راقم حروف کے لئے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ امر یہ تھا کہ ابتدائے قید سے لیکر آخر تک کوئی کتاب رسالہ یا اخبار کسی قسم کا پڑھنے کو نہ ملا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ شب و روز میں جس شخص کا تقریباً کل وقت شغل نوشت و خواند میں گزرتا ہو اسے دفعتاً ان تمام دلچسپیوں سے یکقلم عرصہ دراز کے لئے علیحدہ کر دینا کتنے بڑے جبر کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری نسبت سپرنٹنڈنٹ نے اپنے ماتحتوں کو خاص تاکید کر دی تھی کہ کاغذ قلم پینسل کتاب یا اخبار تک اس شخص کو کسی طرح دسترس نہ ہو سکے۔ اس خاص سختی کے سبب سے چکی پینے کے دوران میں جتنے شعر خیال میں آتے تھے انھیں اکثر کئی کئی دن تک بکوشش تمام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ان غزلوں کے جمع ہونے اور بحفاظت جیل سے باہر پہنچ جانے کا قصہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے پرچے میں درج ہو چکا ہے۔ چکی پینے والوں کی نگرانی میں ایک قیدی نمبردار کے سپرد ہوتی ہے۔ راقم حروف چونکہ سال بھر کے قریب چکی خانہ میں رہا۔ اس لئے سیکڑوں قیدیوں اور متعدد نمبرداروں کے وہاں آنے اور تبدیل ہونے کا عجیب و غریب نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تندرست نئے قیدیوں کو عموماً پہلے چکی ہی دیجاتی ہے اس لئے آنے والوں سے سب سے پہلے ملاقات کا موقع چکی خانے والوں ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں منجملہ دیگر نووارد قیدیوں کے ایک اخبار سٹیٹین کلکتہ کے میجر سٹریٹفیل کے بیٹے بھی تھے جنھوں نے اپنے مقدمہ کا فیصلہ بذریعہ جوری کرانے سے انکار کر کے نادانستہ طور پر پوریشن ہونے کا حق کھودیا تھا اور دیسی عیسائیوں کے زمرے میں سمجھ شامل کر دئے گئے تھے۔ ایک عرصہ کے بعد ایک انگریزی داں شخص سے ملکہ نہایت خوشی ہوئی۔ زیادہ تر مسرت کا باعث یہ تھا کہ سٹریٹفیل کچھ کچھ اخباری دنیا کے حالات سے بھی آگاہی رکھتے تھے، زمانہ حوالات میں بھی انکو

پاؤں وغیرہ پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا۔ کیونکہ اسوقت تک ان کے ساتھ پوریشینوں ہی کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور تو سب خبریں انھوں نے صحیح بتائیں۔ لیکن مسٹر تلک کی نسبت جو امید انھوں نے ظاہر کی تھی کہ وہ غالباً پریوسی کونسل میں اپنی سے رہا ہو گئے ہوں گے بعد میں غلط ثابت ہوئی۔ مسٹر تلک کی فرضی رہائی کا مزوہ سن کر راقم نے اپنے دلی مسرت کا اظہار ایک فی البد غزل سے ذریعہ سے کیا تھا۔ جس کا مطلع اسوقت تک یاد ہے۔

نسیم صبح کا ہی = پیام جانفرا لائی
تلک کو بیگناہی ان کی لندن سے چھڑا لائی

شوامی شوانند نے بھی ایک ہندی چیز اس موقع پر تصنیف کی تھی جس کا ایک ایک لفظ رنگ تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ خیر مسٹر ریشیل کو دو ہی چار روز چکی پینے کے بعد اس بلا سے نجات مل گئی اور وہ جیل پریس میں پروٹ ریڈری پر بھیج دیے گئے۔ ایک مسٹر ریشیل ہی پر کیا موقوف ہے جتنے لوگ چکی خانے میں تھے، سب اپنے اپنے وقت پر یعنی کوئی ایک ہفتہ پندرہ روز کوئی ایک مہینہ اور کوئی حد درجہ تین مہینے رہ رہ کر دوسری آسان مشقیوں پر چلے چلے گئے۔ حکام جیل کی خاص عنایت سے یہ فخر اس خاکسار ہی کو حاصل ہوا کہ تقریباً سارا زمانہ قید اسی ایک شغل میں گزارنا پڑا، جیل میں ہر دوسرے یا تیسرے مہینے چکی پینے والوں کا منہانہ خاص اسی غرض سے ہوا کرتا ہے کہ جو قیدی وزن میں کم ہو گئے ہوں یا جن کو چکی پیتے کئی مہینے گزر چکے ہوں وہ کسی دوسرے آسان کام پر بھیج دیے جاتے۔ راقم حروف کے زمانے میں تین چار بار ایسے معائنے ہوئے جن میں تقریباً تمام پرانے ساتھیوں کی مشقتیں تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن یہ کمترین جہاں تھا وہیں رہا۔ ایک بار جیلر نے خاص کر میرے لئے تبدیلی مشقت کی سفارش بھی کی اور سپرنٹنڈنٹ کو میرے وزن کی غیر معمولی کمی سے بھی آگاہ کیا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ کی قسوت قلبی نے اس کی جانب بھی کچھ توجہ نہ کی اور میرے ٹکٹ کو واپس کر دیا۔ ہر روز صبح کو سب قیدی جاگتے کہتا تھا کٹوری چکی خانے کے باہر پڑنے میں لگا کر صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور ان سب کی گنتی لیکر دفعتاً باہر سے دروازہ بند کر کے قفل لگا دیتا ہے کھانے کے وقت دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس سے قبل اگر کسی کو رفع حاجت کے لئے دفعتاً کو دروازہ کھولنے کی تکلیف دینا پڑے تو اس تکلیف ہی کا عوض اکثر ڈنڈوں اور سوٹوں کی شکل میں یقیناً ملتا ہے۔ کئی قیدیوں کو تو اس جرم میں اتنی سزا ملی کہ عرصے تک ان کے اعضا مجروح باقی رہے۔ قیدیوں کے مارنے پیٹنے کی قانوناً ضرور ممانعت ہے لیکن جب خود وارڈر قواعد جیل کی پابندی نہیں کرتے تو ان کے ماتحت دفعتاً اس سے اس کی امید رکھنا عبث ہے۔ ہمارے سامنے اسماعیل قیدی کو بیرجم وارڈر نے اس قدر مارا کہ اس کا تمام جسم زخمی ہو گیا اور پھر الٹی سپرنٹنڈنٹ سے شکایت کر کے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈلوادیں۔ قصور اس کا صرف اتنا تھا کہ ہاتھ میں ضرب آجانے کے سبب سے اس نے چکی پینے سے اپنی معذوری ظاہر کی تھی۔

جب کبھی گودام میں ضرورت سے زیادہ آٹا جمع ہو جاتا ہے تو دو ایک روز کے لئے چکی والے قیدی کسی دوسرے کام پر بھیج دیے جاتے ہیں۔ زیادہ تر انھیں کنگ مشین پر کرنی کاٹنے یا بنولے صاف کرنے کی خدمت ملتی ہے۔ لوگ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اسی بہانے سے کم از کم اپنے احاطے سے باہر نکلنے اور دن بھر کھلے میدان میں رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن راقم حروف اس عارضی لطف سے بھی محروم رہا۔ کیونکہ جب کبھی ایسا موقع ہوتا تھا تو وارڈر مجھ کو باہر جانے والے گروہ سے الگ کر کے چکی خانے ہی میں بند کر دیتا تھا۔ اور تہر درویش بجان درویش۔ اس روز اکیلے ہی چکی پینا پڑتی تھی۔ صرف ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وارڈر کی عدم موجودگی میں میں بھی اور لوگوں کے ساتھ احاطے سے باہر گیا۔

۱۔ داخلہ جیل سے قبل راقم حروف کا وزن ۱۳۲ پونڈ تھا لیکن اسوقت صرف ۱۰۸ پونڈ باقی رہ گیا تھا۔

بنوے صاف کرنے کی مشین ہمارے احاطے سے کسی قدر فاصلے پر ایک ایسی جگہ نصب تھی جہاں چاروں جانب درختوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے فوج دیہات کی صورت پیدا ہوگئی تھی۔ قیدیوں نے اس موقع کی پوری قدر کی۔ یہاں تک کہ قیدی نمبردار نے بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی سختی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ قیدیوں کے دو گروہ کر دئے گئے تھے جو باری باری سے بیلوں کی طرح مشین کو گھماتے تھے۔ ہر گروہ اپنے وقت فرصت کو کشتی لڑنے ہنسی مذاق یا راگ راگنی میں صرف کرتا تھا۔ ہمارے گروہ میں ضلع جھانسی کا ایک میراثی غوث نام تھا۔ لوگوں کے اصرار سے اس نے اردو ہندی کی کئی چیزیں خوب گائیں۔ راقم حروف کی طبیعت کو چونکہ موسیقی سے ایک فطری انس ہے اس لئے غوث کی نغمہ سنجی نے دل پر قیامت کا اثر کیا۔ اس گانے کی تاثیر اس حسن اتفاق سے اور بھی زیادہ ہوگئی کہ ہندی چیز غوث پاک محبوب سبحانی حضرت سید عبدالقادر جیلہ رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں تھی جنکی غلامی پر اس فقیر کو ہزاروں ناز ہیں۔ طرہ تریہ کہ اس ٹھمری کے آخر میں تخلص راقم کے عزیز بزرگ مولوی سید فخر الحسن فطرت موہانی کا نکلا وہ ٹھمری یہ ہے :-

سنسار تھا رو نام چپے بگداد کے مورو کا سفیا

تیرا بغداد

نیہ کی آگ لگی تن ماں دن رین کہت دیا دیا
محبت رات دن

کت جائے پیا چیری تیری سگبی ہوں بیت کی میں گھیری
کہاں مصیبت

گرب نواج آمار لو اب مورے سرے دکھ کی گا گریا
غریب نواز

بھراج دیا کی ایک بخر فطرت کا سر قوری چوکھٹ پر
نظر

حنین کا صدکا پار کرو منجھار سے موری ناوریا
صدقہ

چکی خانے میں پسائی کا کام عموماً وقت مقررہ سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی ختم ہو جایا کرتا تھا۔ اسی لئے داروغہ کے آنے تک کا وقت باہم قیدیوں کی بات چیت یا کبھی آہٹا اودل کی رزمیہ نظم کے سننے میں صرف ہوتا تھا۔ راقم نے چونکہ کبھی اس لاجواب ہندی ایپک کو غور سے نہ سنا تھا اس لئے اس کی خوبیوں سے نا آشنائے محض تھا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ہندی زبان میں اس سے بہتر کوئی رزمیہ نظم اس وقت موجود نہیں ہے۔ اس نظم کی خوبی اور عوام کی نظروں میں اس کی پسندیدگی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اس وقت ہمارے صوبہ میں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جنہیں یہ افسانہ ازہر یاد ہے۔ ایک مینی ہی کے سنٹرل جیل میں دس بارہ قیدی جن میں دو مسلمان بھی تھے۔ اس داستان کے حافظ موجود تھے۔ ضلع کانپور کے ٹھاکر باسدیو سنگھ اور ضلع لکھنؤ کے پنڈت تلسی رام کی آہٹا کو ہم لوگ روزانہ بڑے شوق اور انتہا درجے کی توجہ سے سنا کرتے تھے۔

(۹)

راقم حروف کے چکی خانے میں داخل ہونے کے وقت دو برقداز نگران کار مقرر تھے ایک میر مظفر حسین صاحب فوق

بجنوری اور دوسرا ضلع باندہ کا بندہ امیر۔ جن میں سے میر صاحب کو تو دو ہی تین روز میں صرف میری وجہ سے جیل پریس کی نگرانی سپرد ہو گئی، بندہ سے البتہ بہت روز تک سابقہ رہا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے نائب جیلر کا اشارہ پا کر بلا وجہ میری پیشی کرا دی تھی، لیکن بعد میں اپنی غلطی پر نادم ہوئے۔ فی چکی دو قیدیوں کے حساب سے چکی خانہ میں جتنے قیدیوں کی ضرورت ہوتی ہے برقعہ دار اس تعداد سے ہمیشہ دو ایک آدمی زاید ضرور رکھتا ہے تاکہ اگر کوئی قیدی دفعاً بیمار ہو جائے یا اور کوئی وجہ پیش آجائے تو کام بند نہ رہے۔ ان زاید آدمیوں کی نسبت برقعہ دار کو اختیار حاصل رہتا ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لے لے یا لے بھی تو محض برائے نام مثلاً کسی کمزور قیدی کی مدد کر دینا یا کسی دیر میں کام ختم کرنے والے کا آٹا چھینوا دینا وغیرہ اگر مخبری کا ڈر نہ ہوتا تو مجھے زاید لوگوں کے زمرے میں داخل کر لینے سے غالباً بندہ کو انکار نہ ہوتا۔ لیکن نائب جیلر کے خون سے اس غریب کو کبھی میرے ساتھ رعایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور رمضان شریف کا پورا مہینہ مجھ کو چکی ہی پیتے گزرا۔ بندہ اس مصیبت میں میرے ساتھ ہمدردی ضرور کرتا تھا لیکن مخبروں کی مخبری اور نائب جیلر کی سیرجی کے خیال سے بیچارہ بالکل مجبور تھا۔ بندہ کے بعد امروہے کے منشی ایزد بخش برقعہ دار ہوئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک تو بندہ ہی کی پیروی کی لیکن آخر کار اتنی رعایت کرنے لگے کہ جب کبھی موقع ہوتا تھا تو وہ مجھ سے کام نہ لیتے تھے۔ دسمبر کے آخری اور جنوری کے ابتدائی ہفتوں میں ان کی یہ رعایت مجھ کو بہت عنینت معلوم ہوئی، کیونکہ ایسی سخت سردی میں بالکل برہنہ تن ہو کر چکی پینے کے لئے دن بھر کھڑے رہنا کارے دار کا مضمون تھا ایزد بخش کے بعد رکسول ضلع مظفر پور کے منشی عبدالحق آئے۔ یہ صاحب حضرت فوق کی طرح شاعر تو نہ تھے تاہم کچھ نہ کچھ شوق شعرو شاعری سے ضرور رکھتے تھے، ایک روز وہ اپنے ہمراہ متفرق اشعار و غزلیات کا ایک مجموعہ بھی لائے جسے جیل پریس کے کسی خوش مذاق قیدی نے اپنے دل پہلانے کے لئے مرتب کیا تھا۔ اپنا کام ختم کر چکنے کے بعد جب میں ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے وہ بیاض مجھے بھی دکھلائی۔ ایک عرصہ دراز کے بعد کتاب کی شکل دیکھ کر جتنی مسرت مجھ کو حاصل ہوئی اس کا اندازہ کوئی آزاد شخص ہرگز نہیں لگا سکتا۔ لیکن افسوس کہ اس واقعہ کی اطلاع کسی نامعقول نے نائب جیلر کو بھی کر دی چنانچہ اس نے دفعاً کسی برقعہ داروں کے ہمراہ آکر چکی خانے کا محاصرہ کر لیا اور فرداً فرداً ہر قیدی کو بالکل برہنہ کرا کر کے تلاشی لی مطلب تو اس کا مجھ پر الزام لگانا تھا مگر جب میرے پاس کچھ نہ نکلا تو سارا وبال غریب عبدالحق کے سر پڑا۔ انہوں نے بہت کچھ معذرت کی۔ لیکن نائب جیلر کی فطری بے رحمی پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور اس نے دوسرے ہی دن سپرنٹنڈنٹ سے کہہ سنکر ان کی برقعہ دارسی توڑ وادی اور معمولی قیدی بنا کر آکرہ کو چالان کر دیا۔

(۱۰)

جیل خانوں میں عام طور پر اتوار کے روز تعطیل کا دستور ہے لیکن الہ آباد سنٹرل جیل میں چکی پینے والے کے سوا باقی اور قیدیوں کو اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے لیکن حکام جیل کی حرص قیدیوں کو ہفتے میں ایک دن کی بھی فرصت دینا گوارا نہیں کرتی۔ کیونکہ حکومت نے قید خانوں کو اچھے خاصے کارخانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے جن کا ایک روز کے لئے بھی بند رہنا جیل کی مالی امداد میں کمی واقع ہونے اور اس لئے آخر سال پر حکام جیل کی حسن کارگزاری میں نقص پیدا کر دینے کا موجب ہو سکتا ہے۔ مہذب ممالک میں مجرموں کی اصلاح خصوصیت کے ساتھ مد نظر رہتی ہے لیکن ہندوستان میں وہاں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے اور ان پر کم سے کم خرچ کرنے کے سوا اور کوئی اصول پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اتفاقی طور پر سپیٹ میں درد پیدا ہو جانے یا بخار آجانے کا عذر کر کے اگر کوئی شخص کام کرنے سے عذر کرے تو شفا خانے بھیجے جانے کے بجائے یقیناً اسے اول تو وارڈ اور بعد ازاں نائب جیلر کے ڈنڈوں کی سخت

مار برداشت کرنا پڑے گی۔ قصہ مختصر یہ کہ اتوار کو بھی عموماً تقریباً کل قیدی یا تو اپنے اپنے کارخانوں کو کام کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں یا کوئی اور بیگاری کام انھیں دیدیا جاتا ہے۔ اتوار تو اتوار عید، بقرعید، محرم وغیرہ کو بھی تعطیل کا اور بیلوں میں دستور ہو تو ہوتینی میں مسلمانوں کے ان مذہبی تہواروں کا بھی مطلق نہیں لحاظ رکھا جاتا۔

چنانچہ بقرعید کو مسلمان عموماً مجبوراً نماز پڑھنے سے محروم رہے۔ صرف چند برقدازوں اور بعض مخصوص قیدیوں نے یکجا ہو کر نماز پڑھی۔ راقم حروف کو میر مظفر حسین صاحب نے خاص طور پر سفارش کر کے تھوڑی دیر کی چھٹی دلا دی تھی ورنہ میں بھی کچھ نہ کر سکتا۔ مسلمانوں کے ساتھ تو ایسی بے اعتنائی اور عیسائیوں پر یہ مرحمت کہ بڑے دن کی تقریب میں قیدیوں کو چھٹی کے علاوہ فی کس آدھ آدھ پاؤ گڑ بھی تقسیم کیا گیا۔ یورپین اور یورشین قیدی یوں بھی جس آرام سے رہتے ہیں اس کا ذکر ہم کسی گزشتہ پرچے میں کر چکے ہیں۔ بڑے دن کو حکام جیل کی جانب سے ان سب کی دعوت کیجاتی ہے اور طرح طرح کی مٹھائیاں میوے اور سگریٹ تقسیم کئے جاتے ہیں نماز پڑھانے کے لئے پادری برابر آیا کرتا ہے۔ مسلمان غریب اگر بجائے خود بھی چاہتے ہیں تو قواعد حیا و شریعت کے خلاف انھیں مجبوراً بحالت نیم برتنگی نماز ادا کرنا پڑتی ہے۔ اگر جانگیا میں صرف ایک یا دو بالشت کپڑا زیادہ لگایا جائے تو کافی ستر پوشی ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ہو تو کیونکر ہو قیدیوں کی تو کوئی کچھ سنتا نہیں ہے۔ رہے آزاد مسلمان ان کو انگریزوں کی خوشامد اور مسلم لیگ کے ذریعہ سے خاص رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش سے کب فرصت ملتی ہے اور کبھی ملے بھی تو بھلا حکومت کے مقرر کردہ قواعد پر اعتراض کرنے کا گناہ اُن سے کیوں سرزد ہونے لگا۔ اس موقع پر شاید ناظرین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قیدی ان تمام اہتروں کی شکایت افسران جیل سے کر کے انسداد کی فکر کیوں نہیں کرتے۔ اس کا افسانہ طول و طویل ہے وارڈ یا نائب جیلر سے کسی قسم کی شکایت کرنا بالکل فضول ہے کیونکہ جو کچھ سختیاں جیل میں ہوتی ہیں وہ یا تو خود ان کے اشارے سے ہوتی ہیں یا کم از کم ان پر انھیں کچھ اعتراض نہیں ہوتا۔ رہا سپرنٹنڈنٹ جیل۔ اس تک اول تو کسی کی رسائی نہیں ہوتی۔ یا اگر کبھی پریڈ وغیرہ کے موقع پر کچھ کہنے سننے کا موقع بھی ملتا ہے تو نائب جیلر کی غضب آلود نگاہ کے اثر سے ”عذر“ کرنے والے کے ہوش و حواس ابتدا ہی میں غائب ہو جاتے ہیں اس پر بھی اگر کسی نے جی مضبوط کر کے کچھ غرض کیا تو سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر اس کا مطلب انگریزی میں نائب جیلر سے دریافت کرتے ہیں جو اس قیدی کی شکایت کو اپنی تشریحوں اور توجیہوں کے ساتھ اس شکل میں پیش کرتا ہے کہ اکثر اُس غریب کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ مثلاً الہ آباد کے سبحان نے عذر کیا کہ میرے ہاتھ کا گنا اُترا ہوا ہے اس لئے مجھ کو آسان کام دیا جائے نائب جیلر نے بحیثیت ترجمان اس بیان پر اپنی جانب سے اتنا اور بڑھا دیا کہ میرے خیال میں یہ شخص بہانہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چکی خانے سے اس کی مشقت تو تبدیل ہوئی نہیں البتہ ایک ماہ کے لئے بیڑیاں اس کے پیروں میں اور ڈال دی گئیں۔ چیری ضلع الہ آباد کے خلیل کی ایک اٹنگلی کٹنگ مشین میں کسی طرح سے کٹ گئی۔ اس کی نسبت بھی نائب جیلر نے یہ بات جرّی کہ اس نے کام سے جان بچانے کے لئے اپنا ہاتھ خود زخمی کر لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے میعاد سیڑیوں کے علاوہ تین مہینے کے لئے چکی ان کے نام لکھی گئی۔ پچارے ایک ہاتھ سے چکی پیستے تھے اور نائب جیلر کی جان کو روتے تھے۔ طرفہ تر یہ کہ کوئی شخص بطور خود اپنا حال سپرنٹنڈنٹ سے انگریزی میں نہیں عرض کر سکتا۔ کیونکہ انگریز سے انگریزی میں گفتگو کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک بار بحالت ناواقفیت نائب جیلر سے کچھ بات انگریزی میں کرنا چاہی تھی کہ ایک ہندوستانی وارڈر اس کے اشارے سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ ناچار خاموشی اختیار کی۔ شکایت کرنے والی کی پریشانیوں کا خاتمہ یہیں پر نہیں ہو جاتا بلکہ عذر کرنے کے بعد نائب جیلر یا وارڈر ہمیشہ کے لئے اس کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس کا نام شورہ پشتوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے۔ سال میں دو بار انسپکٹر جنرل صاحب بھی جیلخانوں

کا معائنہ کرتے ہیں۔ ان کی فریاد رسی اور انصاف پسندی کا افسانہ اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہے۔ جیل میں آپ کی آمد کا ہنگامہ قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے سے آپ کے ملاحظہ کے لئے قیدیوں کو "جیل کی قواعد" سکھائی جاتی ہے۔ سلامی کی پریڈ، نہانے کی پریڈ، بارک بندی پریڈ۔ کھانے کی پریڈ، پانخانے کی پریڈ متعدد پریڈوں کی مشق ناواقف قیدیوں کو پاگل بنا دیتی ہے دن بھر کام کرنے کے بعد پھر مغرب تک اس قواعد کی مصیبت سے ناک میں دم آجاتا ہے۔ قواعد کے دوران میں اگر کبھی نائب جیلر صاحب تشریف لے آئے تو گویا ایک اور بلا نازل ہوئی۔ ہنٹر آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور بیرجمی آپ کے دل میں ذرا بھی کسی سے کوئی غلطی ہوئی کہ آپ نے بلا تکلف ایک ہنٹر رسید کیا۔ انسپکٹر جنرل کے آنے سے ایک روز قبل آپ وارڈروں کے ذریعے سے ہر بارک میں منادی کرا دیتے ہیں کہ جس کسی کو کچھ عذر کرنا ہو وہ پہلے ہم سے بیان کرے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے انسپکٹر جنرل سے کسی قسم کی کوئی شکایت کی تو اس کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ قیدی بھی عموماً جیلخانے کی راہ درسم سے واقف ہونے کے بعد شکایت کر کے خواہ مخواہ مبتلائے مصیبت ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور اس طرح پر "جنڈیل صاحب" فرض ادا کرنے کے طور پر کھمال تیز گامی سارے جیل کا چکر لگا جاتے ہیں اور کوئی قیدی چوں تک نہیں کرتا۔ دوسرے دن رجسٹر معائنہ میں آپ کو یہ عبارت لکھی ہوئی نظر آئے گی کہ "سب قیدی خوش ہیں کسی کو کچھ شکایت نہیں۔ انتظام سب اچھا ہے۔" لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ازراہ بیباکی نائب جیلر و سپرنٹنڈنٹ جیل کی خفگی سے بے پروا ہو کر کھانے کی خرابی وارڈر کی سختی اور حکام جیل کی بیرجمی کی داستان "جنڈیل" سے کہ بھی سنائے تو کیا ہو۔ "اس خانہ تمام آفتاب است۔" محکمہ جیل کے ایک ادنیٰ ملازم سے لیکر انسپکٹر جنرل تک سب کے سب بیرجمی اور بے پروائی کے یکساں رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل کی عدیم الفرستی اول اول تو کسی فریادی کی فریاد کو با اطمینان سننے کی اجازت ہی نہیں دیتی لیکن اتفاق سے اگر آپ متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اس توجہ کا نتیجہ عموماً سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ عذر کرنے والا اُسی وقت کوٹھری میں بند کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن "جنڈیل" صاحب تو چل دیتے ہیں لیکن اُس غریب کی شامت آجاتی ہے کیونکہ جنڈیل سے بلا اطلاع حکام عذر کرنے کے اس سے سخت باز پرس ہوتی ہے اور اس تمام جھگڑے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قیدی کسی دوسری جیل کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں جاتے ہی یقینی طور پر اس کا نام شہرہ پشتوں کی فہرست میں درج کر لیا جاتا ہے۔ انسپکٹر جنرل کے دورے کو زندانی اصطلاح میں جنڈیلی کہتے ہیں۔ قیدیوں کو جنڈیلی سے رحمت اور پریشانی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس سے بلائے ناگہانی کی طرح لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ البتہ دورانِ معائنہ میں دو ایک روز کھانا نسبتاً ضرور اچھا ملتا ہے۔ یعنی معمول کے خلاف روٹیوں کا آٹا مٹی اور چوڑے

۱۔ جیل والوں کی بیدردی کا یہ افسانہ خالی از مبالغہ ہے۔ ثبوت کے لئے سوچنا ہوتا ہے کہ "مشاہدات زندان" کی نسبت آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورنہ کا سوال اور حکومت کی جانب سے اُس کا مہل جواب ملاحظہ طلب ہے۔ بابو صاحب نے دریافت کیا تھا کہ آیا گورنمنٹ کی نظر سے اُردوئے معلیٰ کے یہ مضامین گزرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی۔ انسپکٹر جنرل صاحب نے ہر کمال قمر و بے پروائی جواب دیا کہ گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی ہے نہ آئندہ کی جائے گی۔ یہ جواب جن پر غرور الفاظ اور جس غضبناک ہجے میں دیا گیا ہے اس پر نظر کر کے ارباب انصاف خیال کر سکتے ہیں کہ اگر خداوند خواستہ اڈیٹر اُردوئے معلیٰ یہی شکایتیں کرنل صاحب بہادر سے ایک قیدی کی حیثیت سے کرتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا۔ خوش قسمتی سے حسرت اس وقت آزاد اور انکے قبضہ اقتدار سے باہر ہے۔ ورنہ قیدی پا کر آپ خدا جانے کیا غضب ڈھاتے۔ خیر آپ حاکم ہیں اور ہم لوگ محکوم جو چاہے کیجئے۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر و خود سری کے ساتھ غرور و تمرد زوال کی یقینی علامتوں میں سے ہے۔ سیکلمون الذین ظلموا اسی منقلب یقبلون

کی آمیزش سے پاک ہوتا ہے اور شام کو چلائی کے ساگ یا ڈسٹھلوں کے بجائے ترکاری کے بھی دو چار قتلوں کی صورت نظر آتی ہے۔ مجسٹریٹ علی گڑھ نے میرے مقدمہ میں سزا دہی کے سارے اختیار ختم کر دئے تھے یعنی دو سال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ زیادہ کا اگر انھیں اختیار ہوتا تو شاید اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ہائیکورٹ سے قید کی میعاد گھٹ کر دو سال سے ایک ہی سال رہ گئی لیکن جرمانہ بدستور قائم رہا۔ جس کے عوض میں چھ مہینے کی قید سخت کو ملا کر گویا فی الجملہ ڈیڑھ برس کی سزا باقی رہی۔ حکام جیل مطمئن تھے کہ کم از کم ڈیڑھ برس تک تو یہ شخص ہمارے قابو میں ہے۔ جتنی سختی اس کے ساتھ چاہیں کریں چنانچہ ابتدائے قید سے لیکر دس ماہ تک برابر چکی پسوانا غالباً اسی اطمینان کی بنا پر تھا۔ اگر یہ میعاد قائم رہتی تو ڈیڑھ سال برابر مجھ کو چکی پینا پڑتی۔ لیکن دوران قید میں والد مرحوم کے انتقال کی وجہ سے سبائی صاحب کو مجبوراً کسی نہ کسی صورت سے زر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جو قلیل جائداد وراثتاً مجھ کو پہنچی تھی وہ بھی مجسٹریٹ علی گڑھ کے حکم سے نیلام کر دی جاتی۔ اور سرکاری نیلام جس بیدردی اور بے پروائی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس کا نمونہ اسی مقدمہ میں لوگوں کے پیش نظر ہو چکا تھا کہ زر جرمانہ کے عیوض میں اُردوئے معلیٰ کا کل کتب خانہ جس کی مجموعی قیمت تین چار ہزار روپیوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ صرف ساٹھ روپے میں برباد کر دیا گیا۔ اہل حرد کے متعلق یہ قانون ہے کہ حکم نیلام سے ان کے پیشے کے اوزار متعلقہ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اخبار نویسوں ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ اس درجہ سختی کیوں روا رکھی جاتی ہے کہ ان کی نایاب اور قیمتی کتابیں ناقدر دانوں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول فروخت کر دی جاتی ہیں۔ جرمانہ اسی قدر ہونا چاہئے جس قدر ملزم سے ادا ہو سکے۔ علی گڑھ میں سہر شخص آگاہ تھا اور اس لئے غالباً مجسٹریٹ علی گڑھ بھی ناواقف نہ ہوں گے کہ اڈیشنر اُردوئے معلیٰ ایک فقیرانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسی حالت میں اس پر ۵۰۰ روپے جرمانہ کرنا اصول نا انصاف اور انسانیّت کے کہاں تک موافق یا مخالف ہے۔ اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذمے چھوڑتے ہیں۔ اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اُردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی اس کا بیان نہایت دردناک ہے۔ جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں کن کوششوں اور دقتوں سے ہم پہنچایا تھا۔ جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے دوا دین شعرا وغیرہ کے تھے جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں بھر بھر کے اس طرح سے لے گئے جیسے کہ لوگ لکڑی یا بھوس لیتے ہیں۔ ان کتابوں کی فہرست بنانا تو بہت دور تھا۔ کسی نے ان کو شمار تک نہ کیا۔ اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گزری اس کا ذکر کرتے ہمارا دل دکھتا ہے۔ اس لئے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے سلسلہ کلام کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ اصل ذکر اس بات کا تھا کہ زر جرمانہ کے دفعہ ادا ہو جانے سے قید کی میعاد صرف ایک سال رہ گئی اور پوری مشقت کرنے والے قیدیوں کو فی ماہ تین روز کے حساب سے حکومت کی جانب سے جو رہائی ملتی ہے اسے بھی شامل کر لینے کے بعد میری رہائی میں صرف ایک ماہ بلکہ کچھ اس سے بھی کم باقی رہ گیا۔ اب تو منظمین جیل کے کان کھڑے ہوئے اور انھیں میرے ساتھ اپنے برطاؤ کی سختی کا بھی کچھ کچھ احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ایک روز خلافت معمول شام کے وقت بارک بند کرنے کے موقع پر نائب جیلر نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم کو کوئی دوسری مشقت دیجائے گی اسے پسند کر دو گے یا نہیں۔ لوگوں کو جناب موصوف کے اس غیر معمولی اظہار لطف و کرم پر کمال تعجب تھا لیکن راقم حروف کو ان کی نیت کا حال معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز کے لئے کسی کارخانے میں بھیجنے سے اس کے سوا اور کوئی عرض نہیں ہے کہ مجھ سے تمام میعاد چکی پسوانے کے الزام سے بچنے کی صورت اور قسم کھانے کی گنجائش نکل آئے۔ پس میں نے تبدیلی مشقت کے اس عجیب تحفے کو قبول کرنے سے یکقلم انکار کر دیا

لے تجربے سے ثابت ہوا کہ میرا قیاس بالکل صحیح تھا کیونکہ صریحات متحدہ آگرہ دادہ میں (بقیہ نٹ نوٹ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ فرمائیے)

(۱۱)

زمانہ قید کے ابتدائی ایام کی سختی ضرب المثل ہے کہ قیدیوں کے ان چند دنوں کی بچینی ساہا سال کے کرب و اضطراب سے بھی بڑھ جایا کرتی ہے۔ ابتدا میں جیل کی تکلیفوں سے نیا سابقہ پڑتا ہے اس لئے نو گرفتاران مصیبت کو کچھ روز تک مشاہدات زندان میں عذاب دوزخ کا نمونہ نظر آیا کرتا ہے مگر رفتہ رفتہ بمصدق ”برسر اولاد آدم ہرچہ آید بگذرد“ طبیعت ان سب

(بقیہ فٹ نوٹ بہ سلسلہ صفحہ ۲۳)

انسپکٹر جنرل جیل خانجات نے میرے متعلق آنریبل باؤنگنگا پرشاد صاحب ورما کے ایک سوال کا جواب ایسے مبہم اور پُر فریب الفاظ میں دیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ممبران کونسل کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر میرے اس انکار کو بھی اپنے مفید مطلب چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ”ایک موقع پر ملزم نے خود کسی دوسری مشقت کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا“ انسپکٹر جنرل کا یہ مبہم جملہ اپنے پُر فریب مفہوم کے ذریعہ سے لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کرانا چاہتا ہے کہ گویا اڈیٹر اردوئے معلیٰ نے چکی کی مشقت کو از خود دوسری مشقت پر ترجیح دی ورنہ حکام جیل اسے دوسرا کام دینے پر آمادہ تھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اصل واقعہ اور انکار کا صحیح موقع وہ تھا جس کا ذکر اس مضمون میں کر دیا گیا ہے۔ کیا کرنل صاحب کی افیشل راستبازی ہمارے اس بیان کی بھی کچھ تاویل کر سکتی ہے۔ کرنل صاحب نے یہ بھی گفٹشانی فرمائی ہے کہ روزانہ ایک من غلہ پینے کا بیان غلط ہے۔ عام قیدیوں کی طرح اڈیٹر اردوئے معلیٰ کو بھی پندرہ سیر گیہوں ۲۰ سیر چنے کو ملتا ہے۔ نیز یہ کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کو اختیار ہے کہ جس قیدی کو جس سخت مشقت کے لائق دیکھے اس پر لگائے۔ اس مختصر بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اولیٰ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اڈیٹر اردوئے معلیٰ کے ساتھ کوئی خاص سختی نہیں کی گئی بلکہ عام قیدیوں کی طرح چھ سیر غلہ صاحب نے اسے صرن چکی پینے کے لائق سمجھا اس لئے اس سے برابر چکی ہی پسوائی گئی۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ کسی نیک چلن قیدی کا پورے میعاد تو کیا نصف میعاد تک چکی پینا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ جو مقامی میعاد کے گزرنے پر عام قیدی پہرے دار اور زیادہ سے زیادہ نصف میعاد گزرنے پر ہر قندار بنادیا جاتا ہے۔ جس کا کام صرن دوسرے قیدیوں کی نگرانی کا رہ جاتا ہے۔ کیا انسپکٹر جنرل صاحب کی صداقت شعاری صوبہ جات متحدہ کے تمام جیلوں میں سے ایسے چند قیدیوں کے نام بھی پیش کر سکتے ہیں جن سے بلاوجہ اور بلا تصور ساری میعاد چکی پسوائی گئی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو کرنل صاحب کا بیان یقیناً غلط سمجھا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ روزانہ ایک من غلہ پینے کا ذکر کر کے گویا اڈیٹر اردوئے معلیٰ نے دروغ بیانی سے کام لیا ہے حالانکہ اس میں کچھ بھی غلطی نہیں ہے۔ غلہ تو ایک ہی من پینے کو ملتا ہے البتہ ایک چکی پر دو آدمی پیتے ہیں۔ کیونکہ وزنی چکیاں ایک آدمی سے چل بھی نہیں سکتیں۔ اس حساب سے بیشک بقاعدہ ارتھیٹک فی کس ۲۰ سیر غلہ پڑتا ہے لیکن از روئے تجربہ کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا کیونکہ صحنی دیر میں ایک شخص میں سیر غلہ پیتا ہے اتنی دیر میں دو شخص ملکر ۴۰ سیر نہیں پیں سکتے۔ ایک چکی پر دو قیدیوں کے کام کرنے کی تفصیل ہمارے گزشتہ مضامین میں موجود ہے۔ جن کے مطالعے کا گورنمنٹ کو اقرار ہے لیکن اس اقرار پر بھی ایک درمیانی فقرے کو لیکر ہم کو غلط بیانی کا ملزم قرار دینا اصول دیانت کے سراسر خلاف ہے۔ رہا گیہوں کے پندرہ سیر اور جنوں کے بیس سیر ملنے کا افسانہ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت نہیں ہے۔ الہ آباد سنٹرل جیل میں گیہوں اور جنوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا بلکہ قاعدے کے خلاف گیہوں بھی فی کس ۲۰ سیر کے حساب سے ایک ہی من پینے کو ملتے ہیں جن کا پینا قیدیوں کے لئے عذاب جان ہو جاتا ہے کیونکہ جنوں کی نرمی کے مقابلہ میں گیہوں کی سختی پینے والوں کے چھکے چھڑا دیتی ہے۔ ایک من گیہوں میں صرن پاؤ بھر چکر باقی رکھنے کا حکم ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پہلی اور دوسری مرتبہ آٹا چھاتے سے جتنا چکر نکلتا ہے اُسے دوبارہ اور سہ بارہ پینا پڑتا ہے اور اس طرح پر بلا مبالغہ ایک من کی جگہ ڈیڑھ من کے قریب پینا پڑ جاتا ہے کیا انسپکٹر جنرل صاحب ان واقعات کی بھی تردید کر سکتے ہیں؟ ہمارا ارادہ ان جزوی معاملات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا نہ تھا لیکن کرنل صاحب کے طرز بیان سے مجبور ہو کر ہمیں بھی ”دروغ گو راتا بختانہ باید رسانید“ کے مقولے پر عمل کرنا پڑا۔

ذلتوں کی نوکر ہو جاتی ہے اور مایوسی قیدیوں کے دل میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتی ہے جس کی مدد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔
 ورنہ اگر ابتدائی بیقراری کا عالم بدستور قائم رہے تو ان غریبوں کی زندگی دشوار ہو جائے۔ دو سال - پانچ سال - سہ سال -
 بلکہ چودہ چودہ سال تک کی دراز میعادیں لوگ آسانی کاٹ دیتے ہیں لیکن آخر میں جب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قید کا
 صرف ایک مہینہ باقی ہے۔ صرف پندرہ دن باقی ہیں، صرف تین دن باقی ہیں۔ صرف ایک ہی دن باقی ہے اس وقت کسی کا
 صبر و سکون برقرار نہیں رہتا۔ قواعد جیل کی رو سے قیدیوں کے ٹکٹوں پر رہائی کی تاریخ کچھ روز پہلے متعین کر کے درج کر دی جاتی
 ہے جس کے لئے قیدی خاص کر سپرنٹنڈنٹ کے روبرو طلب کیا جاتا ہے اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ صاحب ازراہ کرم کبھی کبھی
 قیدیوں کو دو چار دن کی رہائی اپنی طرف سے مرحمت فرما دیا کرتے ہیں۔ راقم حروف کو چونکہ شروع ہی سے کسی قسم کی رعایت نہ
 ملی تھی اس لئے اس موقع پر بھی دوسرے معمولی قیدیوں کی طرح سپرنٹنڈنٹ صاحب کے لطف و کرم کی بدولت تاریخ مقررہ
 سے قبل رہا ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ اتفاق سے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے غلات معمول مجھے طلب کئے بغیر حساب کمرے کے
 ۳ جولائی ۱۹۵۲ء تاریخ رہائی مقرر کر دی جس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ راقم حروف کو بزرگان دین کی
 عقیدت کے ساتھ جو فطری انس ہے اس کی بدولت زندان فرنگ میں جیسی کچھ قلبی قوت اور روحانی آزادی اور اطمینان بسر رہا
 اور ضمناً جو باطنی فیوض حاصل ہوئے الفاظ کے ذریعہ سے ان کی حقیقت صحیح طور پر نہ بیان ہو سکتی ہے نہ ان کے ذکر کا
 یہ محل ہے اس لئے ان سے قطع نظر ہی مناسب ہے۔ البتہ آخر زمانہ قید کا ایک واقعہ ایسا ہے جس کے اظہار میں کوئی حرج
 نہیں، معلوم ہوتا ہے۔ ردولی کا عرس شریف ماہ جمادی الثانی کی درمیانی تاریخوں میں ہوتا ہے۔ شےء میں یہ تاریخیں
 ماہ جولائی کی ابتدائی تاریخوں سے مطابقت واقع ہوئی تھیں۔ اتفاق سے میں نے ایک روز سوتے وقت حساب کیا تو معلوم
 ہوا کہ میری رہائی کا دن ٹھیک اسی تاریخ کو مقرر ہوا ہے جو عرس شریف کا آخری روز ہوگا۔ مجھ کو چونکہ حاضری عرس حضرت
 شیخ العالم سے سعادت اندوز اور فیض پذیر ہونے کا اکثر اتفاق ہو چکا تھا۔ اس لئے بے اختیار دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی
 کہ اگر رہائی کی تاریخ دو یا ایک روز قبل بھی مقرر ہوتی تو شرکت عرس کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن تاریخ رہائی کی ٹکٹ پر
 درج ہو جانے کے بعد دوبارہ تبدیل ہو سیکنے کا اس وقت میرے دل میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ پھر بھی صبح اٹھنے پر سب سے
 پہلی بات جو مجھ کو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے غیر معمولی طور پر دفتر کے بجائے نئی تکلیف میں طلب
 کیا ہے۔ نئی تکلیف میں پہونچ کر منشی صاحب سے معلوم ہوا۔ صاحب بہادر میرے استقلال اور ”نیک چلنی“ سے بہت
 خوش ہیں اور اس لئے اپنے اختیار سے غالباً وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی مجھے رہا کر دیں گے۔ اس مزید جانفزا کے سننے سے
 مجھ کو بھی بہت مسرت ہوئی اور یقین ہو گیا کہ شب گزشتہ کی آرزو اب ضرور پوری ہوگی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے دیکھتے
 ہی حکم دیا کہ ہم ان کو پندرہ دن کی رہائی اپنی جانب سے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اور میں تاریخ مقررہ
 سے پندرہ روز قبل رہا ہو کر شام تک الہ آباد میں ٹھہر کر مکان روانہ ہوا اور وہاں دس دن قیام کرنے کے بعد باطمینان تمام
 ردولی روانہ ہوا۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کو لوگ حسن اتفاق پر محمول کریں۔ لیکن راقم کے نزدیک یہ سب کچھ شیخ العالم حضرت
 مخدوم احمد عبدالحق ردولی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی تصرف اور توجہ کا نتیجہ تھا۔ الہ آباد سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر ہڈسن
 عجیب و غریب مزاج کے شخص تھے جن کو کل قیدی ہڈسن بابا کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ”گا ہے ہ سلائے بر بخند و گاہے
 بد شنائے خلعت و ہند“ کے افسانے آپ کے ”در بار پیشی“ کے متعلق اکثر قیدیوں کی زبانی سننے میں آتے تھے۔ سخت گبری اور
 تند خوئی ان کی ضرب المثل تھی۔ جس سے قیدی تو قیدی جیل کے تمام آئاد ملازم بھی ہر وقت ترساں رہتے تھے لیکن ایک خاص
 وصف ان میں ایسا تھا جس نے ان کے جملہ عیوب کو چھپا دیا تھا وہ یہ کہ قیدیوں کو ”نشانات رہائی“ عطا کرنے میں جیسی فیاضی

ان سے ظاہر ہوتی تھی غالباً کسی دوسرے سپرنٹنڈنٹ سے نہ ہوتی ہوگی۔ جس کی بدولت اکثر سات سال کے قیدی پانچ ہی پانچ سال بلکہ کچھ اس سے بھی کم میعاد کاٹ کر رہا ہو گئے۔ الہ آباد جیل کی خرابیوں اور اپنی نسبت حکام جیل کی سختیوں کے باوجود مسٹر ہڈسن کی بعض انتظامی خوبیوں کی تعریف نہ کرنا بعید از انصاف ہوگا۔ مثلاً صفائی اور ظاہری جسمانی صحت کا لحاظ جیسا الہ آباد سنٹرل جیل میں ہوتا ہے ویسا کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا جس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ جیل میں قیدیوں کے کپڑے موسم سرما میں بھی ”جوں“ سے پاک رہتے ہیں۔ درآخالیکہ عام طور پر ”زندان“ اور ”جوں“ لازم ملزوم سمجھے جاتے ہیں۔ ملازمان جیل کی زد و کوب اور سختی جو زیادہ تر قیدیوں سے حصول زر کی غرض سے ہوتی ہے اس کی بھی شکایتیں الہ آباد جیل میں مسٹر ہڈسن کے خون سے بہت کم سننے میں آئیں اور میعاد قید میں تخفیف کر دینے کا حال ہم نے پہلے ہی درج کر دیا ہے قید کی تکلیفوں میں سب سے بڑی تکلیف اس روحانی بے چینی کو سمجھنا چاہئے جو ارتکاب جرائم کے لازمی نتیجہ کی صورت میں یقیناً ہر ”یکبارہ“ قیدی کے عارض حال ہوتی ہے۔ میں چونکہ بعنایت ایزدی اس تکلیف سے آزاد تھا۔ اس لئے ظاہری سختیوں کے برداشت کرنے میں مجھ کو کچھ زیادہ دقت محسوس نہیں ہوئی اور رہا ہونے پر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ایک سال تک مجھے کسی غیر ملک کا سفر درپیش تھا جہاں سے اب میں اپنے وطن کو واپس آ رہا ہوں۔ وطن پہونچکر جہاں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی خواہش تھی وہیں اپنے حدید دوستوں سے جدا ہونے کا کسی قدر افسوس بھی ضرور تھا کہ ان میں سے چند کے سوا باقی سب سے پھر کبھی ملاقات ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ میرا افسوس تو خیر رہائی کی خوشی سے مغلوب ہو گیا تھا۔ لیکن ان گرفتارانِ بلا کو میری جدائی نہایت شاق تھی، جن میں سے بعض کی آنکھیں تو مجھ سے جدا ہوتے وقت بے اختیار اشک افشانی میں مصروف تھیں اللہ تعالیٰ ان سب کو جلد اس مصیبت سے نجات دے، جیل میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے قیدیوں کے اختلاف عادات و اخلاق، زبان و لہجہ کی دلچسپ کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے پھر ان میں سے ہر شخص اپنے عجیب غریب واقعات زندگی کی ایک مختصر سی تاریخ بھی رکھتا ہے جو اکثر اوقات مصنوعی کہانیوں سے بھی زیادہ دلپسند ہوا کرتی ہے۔ راقم حروف بارگاہ بند ہونے کے بعد سے سوئے کے وقت تک اپنا وقت اکثر انہیں افسانوں کے سننے میں بسر کرتا تھا۔ مرحوم عبداللہ غازی آبادی اپنے ”گھٹی کے روزگار“ کی ایسی ایسی حیرت انگیز حکایتیں بیان کرتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے تھے ان کے پاس ایک دیگھی اور اس کے ساتھ کوئی شے اس قسم کی تھی جس کے اثر سے وہ خریدتے وقت ۵ سیر کے بجائے باسانی ۶ سیر تک گھٹی بنیر کسی قسم کے ظاہری خریب کے لئے سیکتے تھے۔ یعنی اس میں ہاتھ کی صفائی کو مطلق دخل نہ تھا۔ کیونکہ خود تولتے بھی نہ تھے بلکہ بیچنے والوں ہی سے تلواتے تھے، پھر جب خود فروخت کرتے تھے تو ۶ سیر کی جگہ ۵ سیر ہی اُسی ترکیب سے دیدیتے تھے۔ ڈاکر بر قنداز نے اُن سے بقسم اقرار لیا تھا کہ رہا ہونے پر ”گھٹی کا روزگار“ ہمیں بھی سکھا دینا مگر افسوس کہ دفعتاً رہائی سے صرف ایک ماہ قبل انہوں نے درخت پر سے گر کر انتقال کیا۔ انہوں نے میرے ساتھ جس انسانیت اور محبت کا برتاؤ کیا، اس کی کیفیت درج رسالہ ہو چکی ہے۔ رہا ہونے پر میں نے سب سے پہلے ان کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہا مگر افسوس کہ قبر کا صحیح نشان نہ مل سکا۔ اب بھی ہر سال شہرت کے موقع پر اپنے دیگر مرحوم اعزاد و احباب کے ساتھ عبداللہ مرحوم کا فاتحہ بھی میں نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔

زید پور ضلع ہمیر پور کے منشی مندلال سابق و لچ ہوسٹ ماسٹر فن زراعت سے بھی بخوبی واقف تھے وہ اکثر محکمہ ڈاک کی خفیہ کارروائیوں اور فن زراعت کے اصول پر ہدیل لکھ دیا کرتے تھے اُردو معمولی اور ہندی خوب جانتے تھے راقم حروف نے ہندی لکھنے پڑھنے کی مشق انہیں سے کی۔

دک پور ضلع بارہ بنکی کے گرجن کورمی پاٹن دین کے مشہور گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی بہادری کے

تھے اکثر سنایا کرتے تھے۔ غریب بیکسوں اور بیواؤں کے ساتھ پاٹن دین کے سلوک کی حکایتیں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوا کرتی تھیں۔ پاٹن دین جس کسی سے ایک بار مدد کا وعدہ کر لیا کرتے پھر اس سے کسی حالت میں روگردانی نہ کرتے تھے۔ چودھری ہمدی حسن صاحب رئیس ضلع بارہ بنکی کا بھی ہم نے اکثر لوگوں کو حد سے زیادہ مداح پایا۔ چودھری صاحب کے مقدمہ کے دلچسپ حالات سننا پاسی اور عبدالکریم ملازم جناب ممدوح کی زبانی سننے میں آیا کرتے تھے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی جانب سے ان پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی۔ واللہ اعلم۔

ضلع پبلی سمیت کے منشی ہدایت اللہ کبوتر بازی کے فن میں کامل تھے۔ کبوتروں کے تمام اقسام اور پھران سب کی خصوصیات اور حالات کے بیان سے وہ کبھی نہ تھکتے تھے۔ میری غزلوں کو وہ بڑے شوق سے لکھ کر یاد کر لیتے تھے۔ ضلع الہ آباد کے پنڈت جگت دھاری چترال کی مہم میں شریک ہو چکے تھے جس کے تمام مفصل حالات سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ اقوام سرحد کے افعال و عادات اور معرکہ چترال کے واقعات کا ذکر وہ نہایت جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ضلع جھانسی کا سنواں کھنگار مہم تبت میں شریک رہا تھا اور اپنے فوج میں بھرتی ہوتے وقت سے لیکر مہم تبت کے بعد گھر واپس آنے تک کے کل حالات تھوڑے تھوڑے روز سنایا کرتا تھا۔ مہم تبت کے دوران میں سرکاری رپورٹوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انگریزوں کا نقصان بہت قلیل ہوا۔ لیکن سنواں کے قول کے مطابق تبتیوں کی بنا کردہ برون پوش خندقوں میں گوروں کی صفیں گر کر ایسی غائب ہو جاتی تھیں کہ پھران کا پتہ نہ لگتا تھا۔ اہل تبت کے رسم و رواج اور وہاں کی عورتوں کے دلچسپ حالات کو سنواں خاص لطف کے ساتھ بیان کیا کرتا تھا۔

امروہہ کے منشی ایزد بخش صاحب کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ چکی خانے کی برقدازی سے پہلے یہ درزی خانے میں تھے جہاں کے سارے پوست کندہ حالات ان کی زبانی اکثر سننے میں آتے تھے۔ منشی نول بہاری سے غلہ گودام کا کچھا چٹھا معلوم ہوا کرتا تھا۔ جس کے ظاہر کرنے کی ہمت ہم میں نہیں ہے۔ کید گنج الہ آباد کے کنیش امیر روزانہ صبح کو بھجن وغیرہ گایا کرتے تھے۔ راقم حروف کو ان کے اکثر بھجن اور ہندی گیت بغایت مرفوب تھے خصوصاً وہ جو سری کرشن کی تعریف میں ہوتے تھے مثلاً

دیکھ رہی مائی تیرے دوار اک بالا جوگی آیا، رنگ بھبھوت گلے مرگ چھالاسیں ناگ لپٹایا
لے بھکچھا نکلیں سندرائی موتن سٹھال بھرایا، بھکچھا لیکے کوٹ جا بابا میرا بالک دیکھ ڈرایا
نا چاہوں میں دولت دینا نا چاہوں میں مایا، اپنے گوپال کا درس دیکھا دے درس ہیت میں آیا
لے موہن نکلیں سندرائی آٹھل اوٹ چھپایا، پانچ پیر پکیراں کر کے سنگھی ناتھ بجا یا
جیہہ درشن سُر، نہرہن ترسیں
جسودا گود کھلایا،

(۱۲)

ضلع جوہنپور کے منشی محمد رضا سات سال کے لئے قید تھے۔ ان کی مذہبی عقیدت اور فلاس کو دیکھ کر راقم حروف کو اکثر رشک ہوا کرتا تھا۔ اس مجبوری کی حالت میں بھی ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ کو کسی نہ کسی طرح سے شیرینی منگا کر وہ حضرت غوث پاک کی نیاز ضرور دلاتے تھے۔ جیل میں باہر سے کسی چیز کو اندر لیجانے کی سخت ممانعت ہے۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جانے پر قانون کے خلاف عمل کرنے والے کو چھ ماہ تک کی سزا ہو سکتی ہے۔ لیکن ان سب موانعات کے باوجود

منشی محمد رضا نے کبھی اپنے معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ وظیفہ و ظایف کا بھی ان کو بہت شوق تھا۔ اکثر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد چکی خانے میں میرے پاس آتے تھے اور ذوق و شوق کی گفتگو کے بعد ٹنگ، ہری مرچیں گڑ یا شیرینی بطور تحفہ ضرور پیش کرتے تھے۔ نعت و منقبت کے اشعار سے انھیں نہایت محبت تھی۔ اکثر غزلیں مجھ سے سُکر زبانی یاد کر لی تھیں۔ جن کو رات کے وقت بعد نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ حسن اتفاق کہ میرے رہا ہونے سے دس ہی پندرہ دن قبل ہماری بارک کا ایک برقعہ ناز کم ہو گیا۔ جسکی جگہ منشی محمد رضا صاحب آئے اس تبدیلی پر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔ صبح صادق کے وقت وہ مجھے بیدار کر دیا کرتے تھے اور نماز فجر ہم دونوں ملکر بکمال شادمانی ادا کیا کرتے تھے۔ جب کبھی وہ زانہ یاد آ جاتا ہے تو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے کہ نماز صبح میں سرور قلب کی وہ کیفیت کیونکر حاصل ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے جناب رسالت مآب کی شان میں کوئی شعر پڑھا ہو اور ان کی آنکھیں پر نم نہ ہو گئی ہوں۔

وصلی اللہ علی نور کز و شد نور ما پیدا

زمین از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

کاپی کے منشی عبدالحمید افسانہ گوئی کے فن میں کامل تھے چار پانچ مہینے تک ان کا ساتھ رہا اور کوئی نہ کوئی نیا قصہ وہ ضرور کہتے تھے۔ اس پر بھی ان کی کہانیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ شاہجہاں پور کے چٹا استاد گکھی بانکنے کا کام جانتے تھے۔ جیل کے کاموں میں ”مونج فرش“ ان سے بہتر کوئی نہ بنا سکتا تھا۔ اکثر ان کو گڑ انعام ملا کرتا تھا۔ اس میں سے بکمال فراخ حوصلگی استاد میرا حصہ علیحدہ نکال رکھتے تھے اور کام سے واپس آکر نذر کیا کرتے تھے۔

سوامی شیانند بھی اسی ”مونج فرش“ کے کارخانے میں بان بٹا کرتے تھے اس لئے ان سے جو کچھ پیام سلام ہوا کرتا تھا وہ استاد ہی کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔

ضلع فیض آباد کے بابا سرحداس مہندی کے عالم اور سنسکرت سے بھی واقف اپنے کسی چیلے کے فریب کی وجہ سے چار سال کے لئے قید تھے، انھوں نے بھی جیل میں اپنے فیکری معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ روزانہ بھجن اور سادھن وغیرہ کے علاوہ شام کو گیتش وغیرہ چند لوگوں کو رامائن کا سبق دیا کرتے تھے۔ میں بھی اکثر ان کے درس میں شریک ہوا کرتا تھا۔ صفائی کا بابا صاحب کو بہت خیال تھا چنانچہ روز ان کے چیلے ان کے ڈھولے کے ارد گرد دور تک لیپ پوت کر کے صاف کر رکھتے تھے ان کے واسطے دوزائے خود اکیس بھی مقرر تھیں۔ راقم حردن کے حال پر بابا جی بہت مہربان تھے۔ یہاں تک کہ خاص اپنے چبوترے کے برابر والے چبوترے پر مجھے رہنے کی اجازت دی تھی اور میرے مسلمان ہونے کا مطلق خیال نہ کیا تھا۔ صبح صادق سے بہت قبل اٹھ کر وہ بھی اپنے وظیفے میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جھانسی کی طرف کے پنڈت سیتارام مسٹر تلک کے معتقد تھے اور اس لئے میرے بھی بڑے مداح تھے ان کا کام انگریزی دفتر میں تھا۔ جہاں سے مجھ کو اکثر پبلیکل خبریں انھیں کے ذریعہ سے ملا کرتی تھیں۔ مثلاً بنگال سے نوسحابان وطن کی جلا وطنی کا مجل حال اول اول انھیں سے معلوم ہوا۔

ضلع الہ آباد کے بہاری برقعہ ناز کو انگریزی پڑھے کا شوق تھا۔ روز شام کو وہ مجھ سے سبق لیا کرتے تھے گہار خانے میں ان کی مشقت تھی جہاں سے روز تنوڑی سی پیانہ اور ٹنگ مرچ میرے لئے لانا انھوں نے اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔ کورہ جہاں آباد کے ایک اور قیدی بہاری نام نے بھی اکثر نازک موقعوں پر میری بہت مدد کی مثلاً جس روز نائب جیلر نے منشی عبدالحق صاحب برقعہ ناز چکی خانے کے ساتھ سارے چکی خانے کی بھی تلاشی لی ہے اس وقت ان کا سارا شبہ میری جانب تھا کہ یہی کچھ نہ کچھ لکھا کرتا ہے۔ اتفاق سے ایک غزل کا مسودہ میری ٹوپی میں تھا اور میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ بہاری نے

مجھ سے فوراً پوچھا کہ آپ کے پاس کوئی کاغذ تو نہیں ہے اگر ہو تو مجھ کو دیدیجئے کہ میں اُسے چھپا لوں گا اور اگر میرے پاس نکل بھی آئے گا تو میں آپ کے عوض سزا برداشت کرنے پر بخوشی راضی ہوں۔

غرض کہ وہ پرزہ اُس نے لیکر معلوم نہیں کہاں غائب کیا کہ برہنہ تلاشی لئے جانے پر بھی کہیں دستیاب نہ ہوا۔ لیکن نائب جیلر کے جانے کے بعد پھر کہیں سے نکال کر مجھ کو واپس کر دیا۔

ضلع بجنور کے فشی شام سنگھ آریہ سماج کے ایک پرورش ممبر تھے۔ مزاج ان کا نہایت گرم تھا۔ چنانچہ اسی گرم مزاجی کی بدولت علی گڑھ ڈیری فارم سے ان پر مقدمہ چلا تھا۔ مجھ سے علی گڑھ بھی ہونے کی بنا پر وہ پُرانی تکلیف میں خاص کر ملنے آئے اور پھر اپنی رہائی کے وقت تک ہر قسم کی مدد کرتے رہے۔ فشی رام سروپ اور سوامی شوانند کے ساتھ بھی اُنھوں نے ایسا ہی کچھ سلوک کیا۔

جیلر برقنداز قوم کا پاسی الہ آباد کا باشندہ تھا اور ڈاکر کے جانے کے بعد آخر تک ہماری بارک کا برقنداز رہا۔ جیسا شریفانہ سلوک جیلر نے میرے ساتھ کیا اس پر نظر کر کے اکثر میں خیال کرتا تھا کہ طینت کی نیکی اور بدی کو ذات پات کے قیود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تعلیم کا شوق بھی جیسا میں نے جیلر میں دیکھا ویسا کسی دوسرے شخص میں نہیں دیکھا۔ یادش بخیر مولوی محمد اسماعیل صاحب میرٹھی کی ریڈروں کو پڑھ پڑھ کر اس نے اُردو میں اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی تھی۔ اکثر آموختہ مجھ کو سنایا کرتا تھا اور فارسی عربی الفاظ کے معنی دریافت کیا کرتا تھا۔

غرض کہ ایک سال کے عرصے میں ہزاروں ایسے واقعات پیش آئے اور ایسے سیکڑوں لوگوں سے ملاقات ہوئی جن کا مختصر حال لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوتا۔ لیکن سلسلہ کلام کی غیر معمولی طوالت پر نظر کر کے ہم اس داستان کو یہیں پر ختم کئے دیتے ہیں۔ البتہ ماہ آئندہ میں ہمارے نزدیک انتظام جیل میں جو جو اصلاحیں ہو سکتی ہیں ان کو ہم مختصر طور پر درج کر دیں گے، ان کی طرف توجہ کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے۔

(۱۳)

مجرموں کو قید کرنے سے قانون کا صرف یہی منشا نہیں ہوتا کہ ان کو جسمانی یا روحانی اذیت دیجائے بلکہ ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ آئندہ کے لئے ان کے اخلاق و عادات میں نمایاں درستی ظہور پذیر ہو۔ اور دورانِ قید میں وہ کوئی نہ کوئی بہنریا پیشہ سیکھ کر سوسائٹی کے ایک کارآمد ممبر بن جائیں۔

اگر حکام زندان اس اصول کو پیش نظر رکھا کریں تو جیلخانوں کی بہت سی خرابیاں خود بخود رفع ہو جائیں۔ مگر افسوس کہ ہندوستان میں قید خانوں کی موجودہ حالت ان جبری کارخانوں سے۔ وہ برابر بھی بہتر نہیں جن کے۔ انکوں نے اپنا صرف ایک اصول مقرر کر لیا ہو کہ اپنے پابند و مجبور مزدوروں (قیدیوں) سے زیادہ سے زیادہ کام لیں لیکن ان پر کم سے کم خرچ کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جی لگا کر بہت کم قیدی کام کرتے ہیں، خوراک و پوشاک کے باب میں اگر موجودہ قواعد جیل کی پوری پابندی کی جائے تو بھی قیدیوں کو بہت کچھ آرام مل سکتا ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ سزا دہی اور سختی کے بھنے قواعد ہیں ان کی تو ایک ایک حرف کی پابندی اکثر اوقات ضرورت سے زیادہ کی جاتی ہے لیکن جو قواعد ان کے مفید مطالب ہیں ان کا کس کو خیال تک نہیں آتا مثلاً (۱) قیدیوں کو کافی کس و چھٹانک روٹی ملنا چاہئے لیکن عام طور پر یہ یا ہ چھٹانک سے زیادہ کبھی نہیں ملتی اور وہ بھی زاماتی وزن کے خیال سے اکثر کچی رکھی جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نادار لوگ چکی پیٹے وقت کچا غلہ یا آٹا کھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور بنگے پاس خفیہ طور پر روپیہ پیہ پیو پینچ سکتا ہے وہ بارہ چوہوں سے زائد خوراک مقرر کر لیتے ہیں یا کچا آٹا مول لیتے ہیں۔ جتنے آٹا اس طرح

فروخت کیا جاتا ہے یا چکی خانہ میں کھایا جاتا ہے اس کے بجائے مٹی ملا دی جاتی ہے۔ اب فی کس ایک یا ڈیڑھ چھٹانک کے حساب سے جو آٹا بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے روٹیوں کے ساتھ فی کس آدھ پاؤ دال دئے جانے کا حکم ہے جس میں نمک مرچ اور گھی یا تیل بھی کافی مقدار میں پڑنا چاہئے لیکن دال کبھی ایک چھٹانک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور نمک مرچ یا روغن کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس قیدی کے ہتھ میں اتفاقاً کبھی کوئی مرچ آجاتی ہے وہ اپنے کو بڑا خوش قسمت خیال کرتا ہے ورنہ یہ سب چیزیں دفعداروں کا حق بھی جاتی ہے۔ اگر جیلر یا وارڈر ذرا سی تکلیف، نگرانی کی اپنے اوپر گوارا کیا کریں تو یہ سب شکایتیں رفع ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ ان سب باتوں سے وہ لوگ دیدہ و دانستہ چشم پوشی نہ کرتے ہوں۔

شام کے وقت دال کے بجائے چولائی کا جو ساگ ترکاری کے نام سے قیدیوں کو دیا جاتا ہے اُس میں اور گھانس میں ہم کو کبھی کوئی فرق نظر نہ آیا۔ کم از کم اس کو تو ضرور موقوف کرنا اور اس کے بجائے دال جاری کرنا چاہئے۔

(۲) پوشاک کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ہر ششماہی میں ایک جوڑ کپڑا نیا ہر قیدی کو دیا جائے لیکن الہ آباد سنٹرل جیل میں اس قاعدے کی مطلق پابندی نہیں کی جاتی، اور عام طور پر قیدی چتھیڑے لگائے پھرتے ہیں البتہ اہل قدرت ناجائز طور پر نئے کپڑے خرید کر کے پہنتے ہیں۔ کپڑوں میں سے کرتے اور ٹوپی میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ جانگیا کی لمبائی البتہ کم ہوتی ہے جس کو پینگر نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ کم از کم نازی قیدیوں کو اگر پھیرے والوں کے مانند جانگیا ملا کرے تو یہ شکایت باسانی رفع ہو سکتی ہے۔

(۳) باہم لڑائی جھگڑے پر ہر جیل میں سخت سزائیں دی جاتی ہیں لیکن گالی گالج کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ فحش الفاظ اور گالیاں جیلخانوں میں اس قدر رائج ہیں کہ آزاد لوگوں کی بدترین سوسائٹی میں بھی غالباً اس کی مثال نہ ملے گی۔ عیسائی قیدیوں کی طرح اگر ہندو مسلمان قیدیوں کی مذہبی تعلیم کا کم از کم ہفتے میں ایک بار بھی انتظام ہو سکے تو اس قسم کے بہت سے اخلاقی عیوب ضرور کم ہو جائیں۔

پھر مخبری کرنے یا چنپی کھانے پر قیدیوں کو سزا کی جگہ اکثر جو فائدہ پہنچایا جاتا ہے اسے تو کیکلم موقوف ہونا چاہئے کیونکہ اس سے ان کے اخلاق پر حد درجہ ناگوار اثر پڑتا ہے، خلاف قاعدہ اور اکثر بے تصور ماریٹ سے بھی قیدیوں میں غیر معمولی بیچاری پیدا ہو جاتی ہے اس کا سدباب بھی ممکن ہے بشرطیکہ حکام جیل قیدیوں کی درستی اخلاق کو ذرا برابر بھی اہم خیال کریں۔ (۴) بہت سے قیدیوں کو ہم نے نوشت و خواندہ کا اس قدر شوقین دیکھا کہ اگر ان کو کافی موقع ملتا تو روز ہونے پر وہ اچھے خانے لکھے پڑھے بنکر نکلتے۔ لیکن معلوم نہیں کس سبب سے کتاب تو درکنار کاغذ کا ایک پرزہ تک رکھنا جائز نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے نزدیک اگر ہفتے میں ایک روز تعطیل کے دن یعنی اتوار کو کم سے کم مذہبی کتابیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت ملجایا کرے تو بہت فوہ ہو۔ اس کا انتظام بھی کچھ دشوار نہیں ہے۔ ہر بارک میں جو تین یا چار قیدی برقدار مقرر کئے جاتے ہیں، ان میں سے دو ایک خواندہ ضرور ہوتے ہیں۔ پس بروز تعطیل شوقین قیدیوں کی تعلیم کا اہتمام انھیں کے سپرد کر دینا چاہئے۔

(۵) بعض بعض کارخانوں میں قیدیوں سے ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا ہے مثلاً الہ آباد سنٹرل جیل کے ریڈی خانے میں قیدی طلوع آفتاب کے وقت سے لیکر اکثر اوقات غروب کے وقت تک محنت کرتے کرتے پست ہو جاتے ہیں، ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے۔ ہمارے نزدیک تو لہار خانہ، بڑھئی خانہ، ریڈی خانہ نیز پارچہ بانی اور مونچ فرش وغیرہ کے کارخانوں میں صرف چند پیسوں کی خوراک کے عوض روپیوں کا کام کرنے والے قیدیوں کے نام اگر کچھ قلیل اجرت بھی جمع ہوا کرے جو انکو رہائی کے وقت بطور سرمایہ ملجایا کرے تو مجرموں کا دوبارہ و سہ بارہ قید خانے جانا یقیناً کم ہو جائے۔

(۶) پولیشکل قیدیوں پر عام قیدیوں سے بھی زیادہ سختی کی جاتی ہے اور وہ جیلخانہ کی تمام جائز رعایتوں سے محروم رکھے

جاتے ہیں۔ ایسا ہونا کسی طرح قرن انصاف نہیں ہے اور کچھ نہیں ہو سکتا تو اس غیر معمولی سختی کے معاوضے میں کم از کم اتنی رعایت ضرور ملنا چاہئے کہ اوقات فرصت میں انھیں کتب بینی کی اجازت ہو اور ان میں سے جس کو تصنیف یا تالیف کا شوق ہو اسے اتوار کے روز ایک خاص بارک میں کسی یورپین وارڈر کی نگرانی میں قلم دوات کاغذ کے استعمال کا بھی موقع دیا جائے۔

من انچہ شرط بلاغ ست باتو میگویم تو خود از سخنم پند گیر خواہ ملان

فرنگی جیلخانوں میں گوے اور کالے کی تمیز

یورپین یا یورشین اسباب کے درمیان ایک ایسا عجیب و غریب امتیاز قائم کر دیا جس کی بنا تعصب یا غرور کے سوا اور کسی جہت پر ہو ہی نہیں سکتی۔ افسوس ہے کہ ہنگ کے اس بیجا امتیاز کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ عدالت کے ایوان اور جیل کی کوٹھریاں بھی اس کے حدود کے اندر آگئی ہیں۔ عدالتوں میں فرنگیوں کے ادعائے انصاف کے خلاف گوروں کے ساتھ جو رعایتیں ملھون اور کالوں پر جو یہ سختیاں جائز اور قانوناً جائز رکھی جاتی ہیں ان کی تفصیل ایک جداگانہ دفتر کی محتاج ہے اس موقع پر ہم ان کے بیان سے قطع نظر کر کے صرف جیل کے حالات پر اس لئے اور بھی اکتفا کرتے ہیں کہ جیل کی کیفیت سے عام طور پر لوگ بالکل نا آشنا ہیں۔

۱۔ خوراک۔ کالوں کے لئے صبح کو آدھ پاؤ چنے بطور ناشتہ دئے جانے کا حکم ہے لیکن عموماً قیدیوں کو چھٹانک ڈیڑھ چھٹانک سے زیادہ نہیں ملتے۔ ناشتہ کے بعد کام پر جانا ہوتا ہے، جہاں سے اسے کھانا کھانے کے لئے کچھ دیر کی فرصت ملتی ہے۔ کھانے میں جوار۔ باجرہ۔ ماش اور گیسوں کے مخلوط آٹے کی کچی روٹیاں ہوتی ہیں جس میں گیسوں کی مقدار سے کچھ ہی کم مٹی یا چونا ملا ہوتا ہے جیل کی سخت مشقت سے مٹی تو کیا ہے کھکر پتھر بھی ہضم ہو جائیں۔ ورنہ کسی آزاد شخص کا معدہ اس روٹی کو قبول نہیں کر سکتا۔ ان روٹیوں کو کچا رکھنے کی مصلحت یہ ہے کہ اول تو پکانے کے لئے پتھر کے کوئے اس قدر کم ملتے ہیں کہ نئے دفعیوں (قیدی باورچی) کو کچی روٹی پکانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کچھ روٹی کے بھاری ہونے کے سبب مقررہ وزن کی روٹیاں کم آٹے میں طیار ہو جاتی ہیں۔ بچا ہوا آٹا دوسرے لوگوں کے کام آتا ہے۔ یہی ہوئی روٹی نو چھٹانک ملنے کا حکم ہے لیکن عموماً آٹھ چھٹانک بلکہ کبھی کبھی سات چھٹانک سے بھی کم ملتی ہے اور کسی کو چون دچا کی ہمت نہیں ہوتی راتم حیرت نے ایک بار وارڈر وغیرہ ملازمان جیل کی خفگی سے بے پردا ہو کر بطور تجربہ روٹیاں تلوائیں تو وہ چھ چھٹانک سے کچھ ہی زیادہ نکلیں۔ معلوم نہیں آٹا جو اس طرح بچتا ہے وہ کہاں جاتا ہے اور وہ کس کے صرف میں آتا ہے کیونکہ گودام میں روزانہ مقررہ وزن کے آٹے کا خرچ دکھلایا جاتا ہے۔ روٹی کے ساتھ کھانے کے لئے دیرپہ کوہلی ہوئی بے دلی ارہر عموماً بے روغن و مرچ ملتی ہے اور شام کو چولائی کا ساگ جس کی ادنیٰ صفت یہ ہے کہ پھینک دئے جانے پر کوئے بھی اسے نہیں سونگھتے، ترکاری جو مختلف قسم کی جیل میں ہوئی جاتی ہے روزانہ ڈالیوں میں ملازمان جیل کے لئے بھیج دی جاتی ہے یا کبھی کبھی کچھ ملتی بھی ہے تو وہ پکانے والوں کے صرف میں آتی ہے۔ عام قیدیوں کو کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھنے کو ملتی۔ برطلاح اس کے گوروں کو ناشتے کے لئے ڈبل روٹی، چاء، شکر اور کھانے کے لئے گھی، گوشت، ترکاری، چادل دودھ غرضکہ سب کچھ ملتا ہے اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔

پوشاک۔ کالے قیدیوں کو ایک لنگوٹ ایک جانگیا۔ ایک کرتا ایک ٹاٹ۔ ایک کمبل ایک ٹوپی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا جن میں سے ٹاٹ کمبل ساہا سال کے لئے اور جانگیا کرتا قاعدے کی رو سے چھ مہینے کے لئے لیکن از روئے عمل سال بھر بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ دنوں کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس درمیان میں یہ چیزیں پھٹ جائیں یا خراب ہوں

تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قیدی بغرض احتیاط صرف صبح و شام کو انھیں استعمال کرتے ہیں باقی سارا دن کام صرف لنگوٹ باندھ کر کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس ان کپڑوں سے زیادہ کوئی چیز پائی جائے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے برخلاف اسکے گوروں کو بوٹ کے کئی جوڑے مع موزوں کے ملتے ہیں۔ پہننے کے لئے متعدد سوٹ جن کے دھونے کے لئے علیحدہ ہندوستانی قیدی دھوبی کا کام کرتے ہیں لیٹے کے لئے مسہری اُس پر گدا اور چادر غرضکہ آرام کی تمام چیزیں ہبیا کی جاتی ہیں۔

جائے قیام و دیگر ضروریات - کالوں کے رہنے کے لئے بارکیں ہیں جن میں برابر برابر مٹی کے ڈھولے یا ادٹے (چبوترے) بنے ہوتے ہیں جاڑا گرمی برسات غرضکہ ہر موسم میں انھیں پر سونا چاہئے۔ سخت گرمی کے دنوں میں کاغذ وغیرہ کا مصنوعی پنکھا بھی رکھنا ممنوع ہے۔ رات کو پانچانے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہوتا۔ جس سے بعض اوقات سخت تکلیف ہوتی ہے۔ صبح کو جب بارک کا دروازہ کھلتا ہے تو سب قیدی ٹیک ساتھ پانچانے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھے قیدوں کو آخر تک منتظر رہنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی جب گھنٹی سے کام لیا جاتا ہے تو اور بھی زیادہ دقت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ گھنٹی دو یا تین منٹ سے زیادہ پانچانے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی جس کے بعد بلا توقف باہر نکل آنا چاہئے۔ عام اس سے کہ کل قیدی فاسغ ہوئے ہوں یا نہ ہوں۔ پانچانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے کا کوئی وقت نہیں ملتا بلکہ اکثر وہاں سے سیدھے کام پر بھاگنا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے گوروں کے لئے فی کس ایک کمرہ علیحدہ ملتا ہے جس میں ایک آہنی پلنگ گدے دار ایک میز ایک اسٹول ایک لیمپ اور ہر کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ اور ایک پانچانہ موجود ہوتا ہے غسل خانہ میں تولیا۔ صابن ہر شے موجود رہتی ہے۔ رات کو لیمپ کی روشنی میں اور دن کو فرصت کے اوقات میں گورے قیدی کتابیں اور کبھی کبھی اخبار بلا تکلف دیکھتے ہیں۔ ان کے لکھے کو دوات قلم ہر وقت موجود رہتا ہے حالانکہ کالوں کے لئے کتاب دیکھنا تو درکنار اگر ان کے پاس کاغذ کے ایک پرزے کا بھی شبہ ہو تو قیامت آجائے۔ چنانچہ خود راقم حرن کی ایک بار اسی شبہ میں یورپین وارڈر کے حکم سے جامہ تلاشی لی گئی اگرچہ کچھ برآمد نہیں ہوا۔

سب سے بڑا تاشہ یہ ہے کہ ہر یورپین قیدی کے کمرے پر دو ہندوستانی قیدی رات بھر منکھا قلی کا کام دیتے ہیں۔ بارہ بجے تک ایک اور پھر صبح تک دوسرا قیدی پنکھا کھینچتا رہتا ہے۔ "فاعتبروا اولی الالبصار"

فرائض مذہبی اور عام برتاؤ - گوروں کے لئے ہر ہفتہ میں ایک یا دو بار پادری صاحب آ کے دغظ فرماتے ہیں اور ایک جگہ نماز پڑھی جاتی ہے لیکن کالوں کے مذہبی ضروریات کی جانب کبھی بھولکر بھی توجہ نہیں کی جاتی۔ عام قیدیوں کی پوشاک میں جانگیا کی لمبائی اس قدر کم ہوتی ہے کہ جسم اسفل ان تک بالکل کھلا رہتا ہے اور اس طرح پر نماز کے لئے کافی ستر پوشی نہیں ہو سکتی۔ یہ کمی ایسی ہے کہ صرف دو بالشت کپڑا زیادہ استعمال کرنے سے رفع ہو سکتی ہے لیکن کوئی اس کی جانب توجہ نہیں کرتا۔ راقم حرون مجبوراً اسی حالت نیم برہنگی میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ کالوں کے لئے مذہبی وعظ و تلقین کا انتظام تو درکنار اخلاقی جرموں کے ارتکاب پر سزا کے عوض انھیں الٹا انعام ملتا ہے اور بعض حالتوں میں تو حکام جیل ایک طرح پر انھیں ایک دوسرے کی غیبت، جاسوسی، سب و شتم، مار دھاڑ اور ظلم سختی کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ غیبت یا جاسوسی کرنے والے قیدی ہر طرح کی رعایت کے مستحق قرار دئے جاتے ہیں اور قیدی نمبرداروں میں تو خاص کر ایسے ہی لوگ اچھے منظور نظر ٹھہرتے ہیں جو اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ چالاک - پاجی - ظالم اور ہرزبان مشہور ہوں۔ مسلمانوں کے تہوار عید، بقرعید، شب برات، محرم میں شاذ و نادر ہی کسی تہوار پر تعطیل ہوتی ہے حالانکہ گوروں کے لئے بڑے دن کے ایام میں جیلر وغیرہ کی طرف سے دعوت کا سامان کیا جاتا ہے اور ان کو ہر قسم کے میوے اور کھانے دئے جاتے ہیں اس کے علاوہ عام برتاؤ میں گوروں کو کالوں پر ہر طرح سے فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ کام انھیں ہلکا ملتا ہے۔ اپنے عزیزوں یا دوستوں سے ملنے اور خط و کتابت کرنے میں انھیں زیادہ آسانی ہوتی ہے ہر قسم کی پرہیزگار ٹنڈ جیل کار گزار قیدیوں کو رہائی کے جو دن اپنی طرف سے دیتا ہے اُس رعایت سے یہی سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ ملازمان جیل انھیں کسی طرح دق نہیں کر سکتے بلکہ اکثر موقعوں پر دیدہ و دانستہ انکی بے ضابطگیوں سے چشم پوشی کرتے ہیں غرضکہ ہر صورت سے انکی قید کا زمانہ اس طرح سے گزرتا ہے کہ بعض آوارہ مزاج کرائیوں کو تو ہم نے یہ کہتے سنا کہ ہم کو گھر سے زیادہ تو جیل ہی میں آرام ہے۔

تسلیم لکھنوی

۱۲۳۵ھ — ۱۳۲۹ھ

نام و خاندان احمد حسین نام عرف امیر اللہ خلف مولوی عبدالصمد صاحب زمیندار حسن پور و پہاڑ پور مدو سرائے مضافات دریا با دضلع بارہ بنگی کے رہنے والے تھے ۱۲۳۵ھ میں فرنگیوں کی جانب سے شاہان دہلی کا وقار کھٹانے کے لئے نواب غازی الدین حیدر کو بادشاہ اودھ کا خطاب دیا گیا۔ اسی سہ ماہ میں حضرت تسلیم بھی مقام سنگیسی نواح فیض آباد میں پیدا ہوئے، والد آپ کے زمینداروں کی ضمانتی کیا کرتے تھے شدنی وقت کہ ناظم دریا باد کے گیارہ ہزار روپیہ کی ضمانت بقایا کے عوض برجہ آخر قید ہوئے، آپ کے دادا شیخ امان اللہ تاپ نہ لائے اور دونوں مواضعات کو گرد کر کے زر بقایا ادا کیا مگر جہاں شاہی کرچے تھے گدائی کس طرح کرتے رعیت بن کر مرہون کاؤں میں رہنا گوارا نہ ہوا بدوسرا کو ترک کر کے چڑے فیض آباد میں قیام کیا، وہاں کوئی صورت معاش نہ نکلی، آخر لکھنؤ چلے آئے اور عہد محمد علی شاہ بادشاہ میں سپہ گری کی طرف رخ کیا اور عہدہ اوشداری تک پہنچے اس وقت ۱۰۰ سپاہیوں کی پلٹن میں اعلیٰ افسر ایک کمیدان دو اوشدار اور دس تندر ہوتے تھے گویا اوشدار ۵۰۰ سپاہیوں پر دوم درجہ کا افسر ہوتا تھا۔

عہد طفلی اور سلسلہ تعلیم و تربیت آپ نے فارسی کی ساری ابتدائی و انتہائی کتابیں اپنے والد اور مولوی شہاب الدین منصور شاگرد مرزا ناطق مکرانی سے اور عربی کی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولوی عبداللطیف سے کہ مولوی ولی اللہ بھڑاچی کے شاگرد تھے پڑھیں۔ تحصیل علم کا یہاں تک شوق تھا کہ عربی کی تکمیل رامپور میں مولوی سلامت صاحب سے کی۔ فن خوشنویسی میں آپ کو منشی عبدالحی سندیلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ذوق سخن آپ کو صغیر سن ہی میں پلٹن والوں کی صحبت میں حاصل ہوا کہ وہاں اکثر اپنے والد کے ہمراہ چلے جایا کرتے تھے۔ ان ابتدائی غزلوں کا مجموعہ غدر میں تلف ہو گیا بطور نونہ دو شعر درج ذیل ہیں :-

کادش تقدیر ہو تو خاک بھی ملتی نہیں، رہ گیا سرگشتہ مجنوں گرد محل دیکھ کر

اگر بیٹھا نہیں تھک کر کسی کے نخل ماتم پر عزاک کی بو بچھے آتی ہے کیوں بال کبوتر سے

غرض کہ آپ کے ہوش سنبھالنے اور تعلیم پانے کا وقت لکھنؤ میں آیا، پلٹن میں آنے جانے کے سبب سے آغاز شباب ہی میں آپ کا نام سپاہیوں کی فہرست میں درج ہو گیا تھا بلا خدمت تنخواہ ملنے لگی تھی۔

عہد شباب ملازمت شاہی جب آپ کے باغ شباب کا سبز نسیم بہار قدرت سے بہا ہوا آپ کے باغ عمر میں خزاں آگئی ضعف بہت بیٹھ گیا خدمت کے لایق نہ رہے، یہاں تک کہ بادشاہ کے حضور میں اس مضمون کی عرضی گزارنی کہ خانہ زاد بسبب پیرائے سالی و عیالات قابل بجا آوری خدمت نہ رہا، امیدوار ہوں کہ میرا لڑکا مسمیٰ محمد امیر اللہ کہ نوجوان اور پڑھا لکھا ہے میری نوکری پر عوض مقرر کیا جائے۔ محمد علی شاہ نے دست خاص سے یہ حکم لکھا کہ ”موافق سوال

سائل بعل آرند چنانچہ اب دفتر سلطانی میں آپ کا نام بے ہمدہ اوشداری درج کر دیا گیا اور وہی تیس روپیہ ماہوار جو آپ کے والد کو ملتے تھے آپ کو ملنے لگے غرض اپنے والد کے زمانہ پیرانہ سالی سے ان کے انتقال تک آپ برابر فرائین اوشداری ادا کرتے رہے۔ اس زمانہ میں سڑکیں نہایت غیر محفوظ تھیں، کمپنی کی ڈاک کی حفاظت ملازمان شاہی کو کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کی پلٹن بھی ایک کمپنی حفاظت کے لئے کاندو کے نالے سے بادشاہ گنج تک متعین کی گئی تھی کہ محمد حسین نامی زمیندار نے سرکاری ڈاک لوٹ لی۔ سلیم صاحب ریزڈنٹ کا زمانہ تھا اس لئے شاہ اودھ سے سختی کے ساتھ بدظمی کی شکایت کی اس جرم میں وہ کمپنی موقوف کر دی گئی اور آپ بھی موقوف ہو گئے۔ سہرچند کوشش کی مگر تین سال تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس عرصہ میں سوائے مشق شاعری کے کوئی شغل نہ رہا تین سال کے بعد کپتان مقبول الدولہ میرزا جہدی علی خاں قبول شاگرد ناسخ کی معرفت کہ استاد نسیم کے بڑے دوست تھے عرض منظوم اور قصیدہ حضور شاہی میں پیش ہوا، جس پر قلم خاص سے یہ حکم منظوم لکھا گیا۔

بشنو! خوشنویس و اسے خوشگو ہر دو فن میکنی و ہر دو نگو

اسم تو مندرج بہ دفتر شد، بہت دودہ روپیہ مقرر شد

وہی تیس روپیہ جو پلٹن سے ملتے تھے اب جیب خالص سے ملنے لگے۔

ہنگامہ شہداء اور سفر رامپور پلٹن میں اپنے قدیمی عہدے پر ممتاز کر دئے گئے اور ایک سال سے زائد اس پر آشوب

زمانے میں اپنے خدمات بجا دہندہ رہے۔ آخر خیر آباد میں جب افواج باغی منتشر ہوئی تو یعقوب خاں رامپوری جو حیدری پلٹن کے کمیدان اور ان کے دوست تھے آپ کو لئے ہوئے رامپور چلے آئے۔ رامپور آکر ایک مسجد میں قیام کیا اور جو اثاثہ پاس تھا فروخت کر کے کھانے لگے، جب وہ بھی ختم ہو گیا تو منشی نہال الدین صاحب کے یہاں تین روپیہ ماہوار پر لڑکے پڑھانے کی ملازمت اختیار کر لی۔ فکر معاش سے کچھ فرصت ملی تو ایک قصیدہ لکھ کر نواب کلپ علی خاں کے حضور میں کہ اس وقت دلی عہدہ تھے پیش کیا۔ اس تقریب سے کبھی کبھی سلام کو جانے لگے، اسی زمانے میں ایک مشاعرے میں شرکت کی بدولت صاحبزادہ بجن خاں کے یہاں قیام کو جگہ مل گئی اور مسجد کی سکونت سے نجات ملی۔ زمانہ قیام مسجد کی بولتی ہوئی تصویر کیا اچھی لکھنی ہے شکر ہے کیا خوب کئے ہیں مرے یل و نہار رنج و راحت دونوں ہیں اس شہر میں مجھ کو حصول

دن کو بے آتش ہے مطبع سو کچھ ٹکڑے رات کو گاہ مہمان خدا ہوں گاہ مہمان رسول

رامپور کے اسی سفر اول کے موقع پر آپ اپنے جموطن فدا حسین صاحب کے اصرار سے اس مشاعرہ میں شریک ہوئے جس کے صدر مقام پر شہزادہ مرزا رحیم الدین صاحب دہلی کی نواب یوسف علی خاں بہادر مغفور کے ہمنشین تھے نظر آئے غم رکھتے نہیں، گرم رکھتے نہیں، طرح تھی، آپ نے جوں ہی یہ مطلع پڑھا ہے

یادگار ہستی سو ہوم ہم رکھتے نہیں صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں

شہزادہ صاحب نے بے اختیار داد سخن دیکر پوچھا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں۔ جب یہ علم ہوا کہ نسیم شاگرد مومن کے تو صاف کہہ دیا کہ وہی تو میں حیران تھا کہ لکھنؤ والے اس رنگ کو کیا جانیں، وہاں تو انگیا کرتی کا مضمون خوب کہتے ہیں۔ اسی حالت میں کچھ عرصے تک رامپور رہے جب گورنمنٹ کا پورا پورا انتظام ہو گیا اور راتے وغیرہ محفوظ ہو گئے تو آپ نے لکھنؤ کا قصد کیا۔ رامپور سے خرنج آباد کان پور ہوتے ہوئے وطن پہنچے۔ وہاں دو مہینے قیام کرنے کے بعد جب فکر معاش دامنگیر ہوئی تو لکھنؤ چلے

آئے۔ یہاں ۱۲۸۲ھ میں نسیم نے انتقال فرمایا۔ نواب محمد تقی خاں سالار جنگی مرزا نسیم کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اپنا کلام استاد تسلیم کو دکھانے لگے۔ یہ ایک بڑا ذریعہ استاد تسلیم کی فارغ البالی کا ہو گیا۔ بظاہر گو دس ہی روپیہ ماہوار دیتے تھے مگر صد ہا نوازشیں تھیں۔ اس کے علاوہ بیس روپیہ ماہوار مطبع نشی نو لکھنویں ہو گیا غرض کہ کچھ روز تک یوں آپ کو بیس روپیہ ماہوار ملتے رہے، افسوس کہ ۱۲۹۲ھ میں نواب مدوح نے انتقال کیا۔

نواب کلب علی خاں بہادر کا زمانہ
آپ مطبع نولکشور کے وظیفہ پر بسر کرتے تھے کہ نواب کلب علی خاں بہادر
راہپور میں مسند نشین ریاست ہوئے اور ہر طرف سے بڑے بڑے نامی گرامی
شعرا نواب صاحب بہادر کی قدر دانی علم و مہنر کا شہرہ منکسر آئے اور خلعت ملازمت سے سرفراز ہونے لگے چنانچہ امیر، امیر
منیر، تاجر، تاجر، داغ، جلال، حیا، صبا، عروج، غنی، غنی، غنی، غنی، منصور وغیرہ کو انھیں کے درباری شعرا ہونے کا
فخر حاصل تھا۔ ایک دن نواب خلد آشیاں نے دریافت فرمایا کہ تسلیم کہاں ہیں حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا نولکشور کے
یہاں ملازم ہیں۔ حکم دیا کہ تسلیم کو بلاؤ۔ چنانچہ آپ منشی امیر احمد کے خط بھیجنے پر رام پور چلے آئے اور زمرہ شعرا میں مبلغ
تیس روپیہ کے ملازم ہو کر دربار میں شریک ہونے لگے۔

رام پور کی مختلف ملازمتیں غرض کئی سال تک یہی رہا کہ بلا شرط خدمت ہر ماہ میں آپ کو تیس روپیہ تنخواہ کے ملجایا کرتے تھے۔ علاوہ بریں ہر عید دو سو روپیہ عطا فرماتے تھے اور متفرق طور پر عطا دکر کم کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ زماں بعد آپ ناظر فوجداری مقرر ہو گئے اور دس برس تک اس عہدے پر قائم رہے، کچھ دنوں جیساکاری کا بھی کام کیا تھا کہ نواب خلد آشیاں نے انتقال فرمایا، تاہم جنرل اعظم الدین خاں کی عنایت سے آپ کو چند روز تک بدستور ناظر رہنے کے بعد اسٹنٹ انسپکٹری مدارس کی خدمت مل گئی، لیکن ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ آپ صرف مدارس رہ گئے اور اس عہدہ مدرس پرست بھی ہیڈ ماسٹر کی غلط رپورٹ پر کونسل کے حکم سے صرف دس روپیہ ماہوار پنشن پر علاحدہ کر دئے گئے اور حکم ہوا کہ یہ سرکاری گزٹ کے دفتر میں کچھ کام کریں جس کے عوض میں باقی بیس روپیہ ماہوار بھی دئے جائیں۔ لیکن بجٹ میں گنجائش نہ ہونے کے سبب سے آپ کو صرف پندرہ روپیہ ماہوار ملے۔ ۱۹۷۷ء میں تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آپ کو اپنی برطرفی کا یقین ہو گیا۔ چنانچہ آپ نے ایک موقع پر لکھا بھی ہے:-

کبھی موقوف ہیں تسلیم پاتے ہیں کبھی نہیں۔ پس کلب علی خاں داخل و خارج میں رہتے ہیں۔ حضرت عرش کے نام ایک خط مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء میں آپ نے لکھا تھا کہ ”میرا حال اب تک بدستور ہے۔ تحفیف کی فہرست میں نام لکھ گیا۔ دارالمہام صاحب نے منظور فرمایا۔ نواب صاحب کی منظوری باقی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو احکام جاری ہوں گے۔۔۔ اگر حکم آخر میں نوکر رہ گیا تو مکان علیحدہ لیکر رہوں گا۔ ورنہ جہاں آب و دانہ لے جائے گا۔ پلا جاؤنگا اور بدقسمتی کہ پندرہ روپیہ ماہوار ریاست منگروں سے مقرر تھے وہ بھی موقوف ہو گئے کیونکہ ریاست کئی لاکھ روپے کی قرضدار ہے۔ غرضکہ اسی پریشانی میں آپ ٹونک گئے لیکن ناکام واپس آئے، پھر مانگروں تشریف لے گئے، وہاں نواب شیخ میاں صاحب نے جن کی تعریف میں آپ کے متعدد قصیدے دیوان دوم میں موجود ہیں باوجود مقروض ہونے کے پچاس روپیہ ماہوار اور خرچ پر روکنا چاہا مگر ناسازگاری آپ و ہوا کے باعث سے آپ جلد رامپور واپس چلے آئے اور کچھ عرصے تک نہایت درجہ پریشان رہے مگر آخر کار نواب حامد علی خاں بہادر فرمانروائے حال نے ولایت سے واپس آکر ولادت فرزند کی خوشی میں لوگوں کی برطرفی رد کردی اور آپ کو بیس روپیہ بطور بخشش ملنے لگے۔ اس موقع پر آپ نے ”اپنا منظوم سفرنامہ سرکار رامپور کہ پچیس ہزار پانچ سو اشعار کا دفتر پیش کیا مگر افسوس کہ صلہ ملنے سے قبل ہی آپ کشمکش دوبارہ سے تنگ آکر مجرور واپس چلے آئے۔ جب تلاش ہوئی نہ ملے اور جب

دوبارہ حاضر ہوئے تو حکم احکام جاری ہو چکے تھے۔ کسی نے اس خزانہ جواہر کو بھی اڑا لیا۔ لیکن آپ نے پھر محبت کی اور اسے دوبارہ نظم کرنا شروع۔ ۱۹۵۷ء میں ایک جلسہ مشاعرہ میں جو صاحبزادہ مصطفیٰ علی خاں صاحب بہادر پرائیویٹ سکرٹری کے دفتر لکھنؤ پر منعقد تھا اور اعلیٰ حضرت بھی رونق افروز ہوئے تھے۔ یہ دوبارہ نظم کیا ہوا سفرنامہ ایک جلد تاریخ کونسل آن ریکیسی اور ایک جلد تاریخ بدیع جملہ تیس ہزار کا سرمایہ بوساطت صاحب پرائیویٹ سکرٹری پیش کیا۔ سرکار بھی خوش ہوئے اور کونسل آن ریکیسی کے زمانہ کی تاریخ مختلف مقامات سے عرصہ تک ملاحظہ فرماتے رہے اور دریافت فرمایا کہ تسلیم کیا چاہتے ہو، آپ نے کہا کہ میری تنخواہ میں جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری کر دی جائے اور فریضہ حج ادا کرنے کا سامان فرما دیا جائے۔ درخواست اول کی نسبت اسی وقت حکم دیا کہ اب سے تسلیم قدیمی تنخواہ پایا کریں بلکہ دس روپیہ ہم اور اضافہ کرتے ہیں۔ اب تسلیم کو چالیس روپیہ ملا کریں۔ دوسری درخواست کی نسبت فرمایا کہ تسلیم پیرانہ سال ہیں، شاید سفر برداشت نہ کر سکیں گے۔

چنانچہ ۱۹۵۷ء سے وقت آخر تک آپ کو چالیس روپے ماہوار ملائے۔ جس کا شکریہ آپ نے دیوان **عمر کے آخری ایام** سوم میں اس طرح ادا کیا ہے

وہ راحت پائی ہے حامد علی خاں کے تصدیق میں عجب کیا خلد میں بھی یاد مجھ کو رام پور آئے
شکر ہے صدقے میں خواب کے اب تک تسلیم عمر کی ہم نے ہر عزت و توقیر کے ساتھ

مگر افسوس کہ پنشن کے بعد ہی ان کا دل و دماغ ہوش و حواس سماعت و بصارت ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ حضرت عرش کے نام آپ کے آخری خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کا مضمون یہ تھا کہ ”میرا ضعف بصارت اور ثقل سماعت صد سے بڑھ گیا۔ دیوار بن گیا ہوں۔ یہ خط اٹکل سے لکھ دیا گیا چند لکیریں کھینچ دیں۔ پھر نہیں پڑھا گیا کہ کہاں صحیح لکھا اور کہاں کوئی لفظ رہ گیا۔ امیر المذہب تسلیم اداہل ماہ اپریل ۱۹۵۷ء میں آپ آنکھ بنوانے کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے شتر گہرا لگ گیا اور غذا بھی ترک ہو گئی چنانچہ پانی کے سہارے چند روز زندہ رہ کر ۲۸ مئی ۱۹۵۷ء پانچ بجے شام کو ۹۶ برس کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ لکھنؤ کی خاک تھی، وہیں ٹھکانے لگی۔ بیا ساقی کہ من مردم گفن از برگ تا کم کن باب سے پرہ غسلم دریں میخانہ خاکم کن

مرحوم کے اخلاق و عادات استقلال مزاج اور پابندی وضع میں مرحوم یکتائے روزگار تھے۔ خلیق اس درجہ کہ آپ سے جو شخص ایک بار بھی ملا وہ ہمیشہ کے لئے آپ کے حسن خلق اور خوش مزاجی کا گرویدہ ہو گیا۔ کبر و اہل کبر دونوں سے نفرت تھی۔ اسلام کی پابندیوں میں مثل کوہ قائم و ثابت۔ بعد نماز صبح و ظہر بلا ناغہ دو مرتبہ تلاوت قرآن اور کثرت درود شریف لازمی۔ دوران علالت میں بھی نماز اور وظیفہ کبھی ترک نہیں فرمایا۔ بیابانک کہ شدت مرض اور عالم بے ہوشی میں بھی زبان پر آیات قرآنی جاری رہتے تھے۔ اور آخر حصہ عمر میں تو آٹھ پیر درود شریف و وظائف کا شغل رہتا تھا۔ مروت مزاج میں اس قدر تھی کہ اپنے اوپر ہر قسم کی تکلیف گوارا کر لیتے تھے مگر کسی دوست یا شاگرد کی دل شکنی منظور نہ فرماتے تھے۔ راقم حروف نے ۱۹۵۲ء میں ایک عظیم الشان مشاعرہ علی گڑھ کالج میں قرار دیا تھا جس میں دہلی، لکھنؤ اور آگرہ کے بہت سے مشہور شعرا کو یکجا کرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرحوم نے باوجود ضعف و خستہ دلی راقم کی درخواست کو رد کرنا پسند نہ کیا اور رام پور سے تشریف لا کر شریک مشاعرہ ہوئے۔ میر جہدی مرحوم مجروح شاگرد غالب بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی یکجائی نے قدر دانان سخن کے روبرو دو روز کے لئے ایک ایسا منظر پیش کر دیا تھا جس کی مثال آئندہ کبھی نہ مل سکے گی، مرحوم اپنے شاگردوں کو بھی ہر بنائے کمال خلق و کسر نفسی

اپنا دوست سمجھا کرتے تھے۔ راقم حروف کے ساتھ جب کبھی حاضری کا اتفاق ہوا آپ نے خلوص اور محبت کا ایسا برتاؤ کیا جس کی یاد دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔ اپنے ہاتھ سے چاء بنا کر پلاتا اور جب تک میں خود رخصت ہو کر چلا نہ آؤں براہِ مخاطب رہ کر گفتگوئے شعر و سخن میں مصروف رہنا آپ کے حسن اخلاق کی ادنیٰ مثالیں ہیں۔

سفرنامہ نواب رامپور کی نسبت فرماتے تھے کہ جب مجھے اس کے چوری جانے کا حال معلوم ہوا تو میں نے خبر لانے والے سے کہا کہ ”سفرنامہ مجھ سے ہے میں سفرنامہ سے نہیں ہوں۔ آج سے پیسے روز تیل کا صرف اور سہی“ چنانچہ اُسی وقت سے آپ نے اپنا یہ معمول کر لیا کہ روزانہ شام کو چراغ جلا کر بیٹھ جاتے تھے اور نماز عشا تک سفرنامہ کو دوبارہ نظم فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ اس غیر معمولی استقلال کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کتاب از سر نو تیار ہو گئی اور پہلے سے بہتر قرار پائی۔ طبیعت آپ کی یہاں تک مرتخاں مرخج واقع ہوئی تھی کہ مدتِ العمر میں آپ سے کسی ہمعصر شاعر سے کبھی کسی قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ وضع کے اس درجہ پابند تھے کہ جس سے جس قسم کا برتاؤ تھا آخر وقت تک ویسا ہی قائم رہا۔ جس جس سے ملتے تھے اور جہاں آپ کی نشست ہوتی تھی۔ اُس میں بلا کسی خاص مجبوری کے فرق نہ آنے پاتا تھا۔ راقم حروف جب اول مرتبہ آپ کی خدمت میں رامپور حاضر ہوا تھا تو آپ مکان پر تشریف نہ رکھتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ چوک میں ایک دوکان ہے۔ کچھری سے واپس آتے وقت قریب شام آپ وہاں روزانہ کچھ دیر ضرور ٹھہرتے ہیں۔ وقت مقررہ پر جب میں اُس دوکان پر گیا تو آپ کو موجود پایا۔ ہر جمعرات کو اپنی پہلی بیوی کے مزار پر فاتحہ پڑھتے جایا کرتے تھے اس معمول میں بھی مرتے دم تک فرق نہ آیا۔ مشاعرہ علی گڑھ کے موقع پر میں نے محبی عبدالقیوم صاحب بدایونی کو رامپور اس لئے بھیجا تھا کہ وہ آپ کو آرام تام علی گڑھ لے آئیں۔ راستے کی ان چند گھنٹوں کی ہمارا ہی اور ملاقات کا آپ کے اتنا لحاظ تھا کہ اس کے بعد آپ کے جتنے گرامی نامے میرے پاس آئے سب کے آخر میں ”منشی عبدالقیوم کی خدمت میں سلام مسنون“ ضرور ہوتا تھا۔ انکسار آپ کے مزاج میں یہاں تک غالب تھا کہ باوجود کمال ہمیشہ اپنے آپ کو ”بیچراں“ سمجھا۔ راقم حروف کی جتنی غزلوں میں آپ نے اصلاح دی ان سب کے ساتھ یہ بھی ضرور لکھ دیا کہ ”یہ اصلاحیں پسند ہوں تو رکھئے ورنہ غزل کو بدستور رہنے دیجئے کہ اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے“ حالانکہ اُن میں سے کوئی اصلاح ایسی نہ ہوتی تھی جس کی نسبت ناپسندیدگی کا گمان بھی ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے اُستادِ مرحوم کی ذات والا صفات مغتنات روزگار سے تھی جس کا مثل نئی روشنی کے اس دور تہذیب میں ملنا محال ہے۔

فہرست تصانیف آپ کا پہلا دیوان قبل اشاعت ہنگامہ ۱۳۵۷ء میں ضایع ہو گیا، اس کے بعد دوسرا دیوان نظم ارجمند ۱۳۸۹ء میں تیسرا دیوان نظم دل افروز ۱۳۹۱ء میں اور چوتھا دفتر خیال ۱۳۹۲ء میں ضایع ہوا۔ پانچویں دیوان کے متفرق اجزا آپ کے بعض رامپوری شاگردوں کے پاس موجود ہیں جس کے ضایع ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی، ان دو احین میں جملہ اصنافِ سخن مثل قصیدہ غزل مخمس مسدس ثمنوی رباعی قطعہ تاریخ وغیرہ کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ ثمنوی نالہ تسلیم و ثمنوی شامِ غریباں نظم ارجمند ساتھ پہلے چھپیں ان کے بعد ثمنوی صبحِ خنداں - دل و جان، نغمہ بلبلی - شوکت شاہجہانی، تاریخ بدیع موسوم بہ تاریخ رامپور ضایع ہوئیں۔ علاوہ بریں سفرنامہ منظوم نواب صاحب رامپور اور تاریخ کونسل آف ریکیسی قلمی رامپور کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہیں۔

اولاد و شاگرد - پہلی بی بی سے آپ کے ایک صاحبزادے حافظ تجمل حسین صاحب لکھنؤ محلہ محمود نگر میں قریب

مقبرہ اسد شاہ رہتے ہیں، ۶۲ سال کا سن ہے ان کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی نہیں، خوشنویس البتہ اچھے ہیں لیکن اب آنکھوں کی معذوری کے سبب سے اس سے بھی کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ امید ہے کہ نواب صاحب رامپور دیرینہ حقوق تسلیم کا لحاظ فرما کر آپ کی بھی کچھ پیش ضرور مقرر کر دیں گے۔

آپ کے شاگردوں میں سے نوروز علی خاں شیدا لکھنوی جو بقول آپ کے ”صاحب دیوان تھے اور اچھا کہتے تھے“ اور مولوی ظہیر احسن شوق نیموی آپ سے پہلے ہی اس دنیا سے سفر کر گئے۔ علمی قابلیت اور تحقیق فن سخن کے لحاظ سے تسلیم کا اور کوئی شاگرد مرحوم شوق کے برابر نہیں ٹھہر سکتا۔ موجودہ شاگردوں میں ضمیر الدین احمد صاحب عرش گیاروی صاحب دیوان اور ماہر فن ہیں۔ صوبہ بہار میں بہت سے لوگ آپ سے اصلاح لیتے ہیں۔ حیات تسلیم کے نام سے استاد مرحوم کے سوانح زندگی آپ ہی نے مرتب کئے ہیں۔ سید عطا کریم صاحب عطا باشندہ بہار بھی ذی علم اور صاحب دیوان ہیں۔ راقم حرون کو بھی حضرت تسلیم ہی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے منشی شبیر احمد ونا رامپوری، مولوی نظیر حسین فریاد بہاری، مولوی شمس الحق خیال رامپوری اور منشی اعجاز الدین صاحب اعزاز ہتھم گلدستہ حریفہ حامدی رامپور بھی آپ کے قدیم شاگردوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ جدید شاگردوں میں حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب صبر رامپوری سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کا خطاب مہبل تسلیم استاد ہی کا دیا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ غلام حضرت خاں صاحب حاذق رامپوری پروفیسر فارسی رامزی کالج الموڑہ، محمد اکبر صاحب نثر رامپوری مولوی عتیق الرحمن خاں صاحب کلیم۔ منشی گنگا پرشاد صاحب شیدا رامپوری۔ حسن افضل بدر بدایونی۔ قدرت علی خاں قدرت۔ احمد حسین خاں صاحب افسر۔ نبی علی کشرہ، محمد علی خاں نکہت اور منشی حبیب علی حبیب وغیرہ اور بھی بہت سے شاگرد زیادہ تر رامپور میں اور کمتر دیگر مقامات ہندوستان میں موجود ہیں۔

تسلیم کی شاعری تسلیم کے زمانہ شاعری کو ہم چار دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ دور اول ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۶۵ھ تک کہ اس عہد میں آپ کا مذاق سخن نشوونما کی حالت میں تھا۔ ہنگامہ ۱۲۵۷ھ میں اس دور کا کلام ضائع ہو گیا چند شعر و ذہن میں باقی رہ گئے تھے وہ دیوان دوم میں زیر عنوان متفرقات موجود ہیں۔ تقریباً یہ سب اشعار معمولی ہیں جن کے مطالعہ سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس ابتدائی مجموعے کے تلف ہو جانے سے دنیا کے سخن کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اور دوم ۱۲۶۵ھ سے شروع ہوا اور ۱۲۹۴ھ میں ختم ہوا۔ اس دور میں حضرت تسلیم کی سخن سنجی شباب کے عالم میں تھی، تسلیم کی شاعری سے مراد دراصل اُسی عہد کی شاعری ہے کیونکہ اس کے بعد آثار پیری کا ظہور شروع ہو گیا۔ یہ زمانہ انحطاط جسے ہم تیسرا دور قرار دیتے ہیں ۱۲۹۴ھ سے ۱۳۱۹ھ تک قائم رہا۔ چوتھا اور آخری دور ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۲۹ھ تک حضرت تسلیم کے زوال سخن کا دور تھا۔ اس عہد کا اکثر کلام آپ کی ابتدائی شاعری کی مانند عموماً بے لطف و بے رنگ پایا جاتا ہے۔

اصناف سخن میں حضرت تسلیم کو جو قدرت ثنوی پر حاصل تھی وہ ان کے ابتدائی اور انتہائی معاصرین میں سے کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ آپ کے تیسرے بلکہ چوتھے دور کی بھی ثنویاں اپنی گونا گوں خوبیوں کے لحاظ سے دیگر اساتذہ کی بہترین ثنویوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر قرار پاسکتی ہیں۔ ثنوی کے بعد قصاید کا درجہ ہے کہ اس صنف کلام ہی میں زوال سخن کے نشان زیادہ نہیں پائے جاتے ہیں۔ اور دوم سے دور سوم کے اور دور سوم سے دور چہارم کے قصیدے لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے گم ہوئے ضرور ہیں۔ لیکن اس گزری حالت میں بھی امیر سے نہیں تو داغ و جلال و ظہیر کے قصائد سے تو ضرور برابری کا دعوٰی کر سکتے ہیں۔

قصیدے کے بعد غزل کا نمبر ہے کہ اس صنف میں حضرت تسلیم کے درمیانی اور آخری رنگ سخن میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے یعنی جہاں عہد نسیم کی غزلوں میں نچنگی کلام - رنگینی الفاظ اور دلپذیری مضامین کے لحاظ سے ہمیشگی کی وہ شان پاتی ہے جس کا جواب ان کے معاصرین میں ظہیر دہلوی کے سوا اور کسی کے ہاں نہیں مل سکتا - وہیں پامالی مضامین، سیرنگی الفاظ اور بے اثری کلام کے اعتبار سے ان کی آخری غزلیں فصاحت لکھنوی یا طاہر فرخ آبادی کی غزلوں سے بھی بڑھ کر بے لطف ہو گئی ہیں - اس مجمل بیان کی تفصیل کے لئے ذیل میں مثنوی، قصیدہ اور غزل کے تین عنوان قائم کر کے ہم حضرت تسلیم کی شاعری کے دور دوم و سوم و چہارم کے منتخب نمونے پیش کئے دیتے ہیں - جس سے اہل نظر کو ہمارے قول کی صداقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا -

(۱) مثنوی - تسلیم کی پہلی مثنوی نالہ تسلیم ۱۲۶۹ھ اور دوسری شام غریباں ۱۲۷۹ھ کی تصنیف ہے ان دونوں مثنویوں کی بحر اور انداز کلام مثنوی غنیمت سے مشابہ ہے دونوں مرزا نسیم کی اصلاح سے مزین ہیں اس لئے دونوں اپنے رنگ میں

لا جواب ہیں -

شکاف کلک رنگیں خندہ زن ہے	مبارک باد آغاز سخن ہے	بھری ہے بے نیازی دعا میں	سر تکلیں ہے عرض مدعا میں
بڑھی ہے ناتامی گفتگو سے	مرا مطلب سوا ہے آرزو سے	خیال آئینہ حیرت فزا ہے	زباں مصروف حمد کبریا ہے
ابھی دے زبان نکتہ زانی...	دکھاؤں جلوہ حسن معانی	اجازت خواہ لطف گفتگو ہے	خوشی بہر رخصت روبرو ہے
نظر لوٹ سخن سے پار سا ہے	ابھی نادیدہ حسن مدعا ہے	سحاب آسا عطا کر چشم گریاں	مصیبت زادہ آغوش طوفاں
رہے بیداریوں کا حفظ آداب	ہوں آنکھیں کبھی منت کش خواب	نہ کم ہو کوئی دن سامان سودا	رہے سر منزل احسان سودا
ترقی پر رہے شوق اسیری	رہے وحشت کو پاس دستگیری	فلک کو لذت ذوق جفا سے	ندوں فرصت تقاضائے بلا سے
پلا ساقی شراب جام حسرت	کہ ہوں خدمت سے اب شتاق نصرت	جو تو نے شیشہ و ساغر اٹھایا	مجھے قول غنیمت یاد آیا،
بیا ساقی بیائے قبلہ شوق	کہ دور آخر شرر باقی ست این فوق	طبیعت جوش پر آنے نہ پائی	عروج فکر دکھلانے نہ پائی
نہ نکلا حوصلہ اپنی زباں کا	قلق ہے دل کو انجام بیاں کا	احبانے کہا ہنگام اتمام	کہ اس کا نالہ تسلیم ہے نام
یہاں تک یہ پسند طبع آیا	کہ گویا دل سے میرے نقل پایا	ہوا ہاتھ سے بہر سال ارشاد	قبول خاطر ار پاپ فن باد

ارباب بنیش غور فرمائیں کہ ان اشعار میں مرزا نسیم کی شاعری کا خاص انداز اپنی تمام سیرنگیوں اور دلپذیریوں کے ساتھ یکتائی کے اس مرغوب و منظور شان میں جلوہ آ رہا ہے جس کی نمود خود نسیم کے سوا اور کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں دریافت نہیں ہو سکتی - میرزائے مرحوم کی لاابالی طبیعت کا افسانہ نگاری کی جانب از خود متوجہ ہونا محالات سے تھا - لیکن مثنوی نو لکشتو کے اصرار نے ناممکن کر دکھایا یعنی یہ کہ نسیم کتاب الف لیلہ کو نظم کرنے پر راضی ہو گئے مگر ابھی ایک ہی جلد تمام ہوئی تھی کہ طبع نازک کو اس فعل عبث سے بیزار پا کر اس شعر پر ختم کلام کر دیا -

لکھا آگے سے طوطا رام جی نے

لکھا یاں تک نسیم دہلوی نے

اس ایک جلد میں بھی جا بجا لطف سخن کے ایسے ایسے نمونے موجود ہیں جن کی خوبی و محبوبی پر حسن کلام کو ہزاروں ناز ہیں اور رنگینی بیان کو ہزاروں غرور - ملاحظہ ہو:-

خبردار او خیال طبع چالاک	کہ ہے وقت ثنائے ایزد پاک	آٹھا پردہ دکھا حسن رقم کو	مبارکباد مضمون دے قلم کو
سنجھل ساقی کہ وقت اب اور آیا	رہوں سپوش پھر وہ دور آیا	مزار رکھتا نہیں بے کیف جینا	تمنا ہے کہ بر سے ابر مینا
ہراک قطرہ لبو بن بن کے ٹپکے	مرے دامن سے جھین جھین کے ٹپکے	طبیعت صورت سے جوش میں ہو	تمنا عزم نوشا فوش میں ہے
نظر آئے کنار جام گلگون،	لب شاعر سے ٹپکے لطف مضمون	دور شوق وقف گفتگو ہو	سخن افسانہ ریز آرزو ہو

گلے مل کے لفظوں سے معافی دکھائیں گفتگو کی نوجوانی | طبیعت محو ہو عرض سخن میں | فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں
اس لغز و تادر شیوہ گفتار کی مثال اگر کہیں اور بھی مل سکتی ہے تو تسلیم کی مثنوی شام غریباں میں، جس کے یہ چند شعر
بطور نمونہ نذر ناظرین کئے جاتے ہیں:-

اجازت اور خیال قاصد دل مضامین لپٹے ہیں فکر رسا سے کسی کو عشق کی لذت عطا کی کہیں طالب کہیں مطلوب ہو وہ کہاں تک ایک سی آہنگ فریاد	کہ آپہونچا دم تکلیف مشکل زباں جنبش میں ہے حذر دے مزا دیتی رہی اندوہنا کی غرض ہر رنگ میں کچھ خوب ہو وہ بدل اب اور کوئی رنگ فریاد	طبیعت پھر مری کچھ ناز پر ہے طلسمی کار خانہ اک بنا کے کہیں ہے التماس شوق دیوار تماشا دوست یار خود نما ہے ملک مشتاق ہیں حرف دعا کے	کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے نظر سے چھپ رہا صورت دکھائے کہیں ہے محرم اسرار انکار تصور بن کے پھرتا جا بجا ہے فلک پر بھیج تحفے التجا کے
ابھی دے کوئی دل سرسبز جوش ہنسے رسوائی حال زبوں پر بڑھے گردن گمانی چشم تر کی رنگ سودا جنوں میں فوں کو تر سے اجل سامان شادی کا سبب ہو سیہ کاری قبول لم یزہل ہو کمی کر شوق مطلب التجا میں	برنگ زخم خنداں غم فراموش بہائے اشک تدبیر جنوں پر قسم کھائے سرداغ جگر کی سے طعنے زبان بیشتر سے صف ماتم صف بزم طرب ہو لباس کعبہ طومار عمل ہو گرہ دے طول زلف مدعا میں	ہمیشہ سائے خنجر میں تر پے نہ ہو پا مال غم کی سرکشی سے نہ ہو کامل مذاق تلخ کامی مروں تیور اگر بدلیں الم کے بڑھیں رتبے یہ جنس سرسری کے بس اے تسلیم کب تک جوش مستی زباں سے مایل ذکر پیغمبر	اگر محشر بھی ہو محشر میں تر پے اٹھائے ناز دشمن بھی خوشی سے رہے ہر مدعا میں ناتامی رکے سینے میں دم رکنے سے دم کے اٹھاؤں ناز قحط مشتری کے کہاں تک شیوہ مطلب پرستی ذہن ہے حلقہ گرداب کوثر
خدا یا ریزش مضمون روشن خدا راے شہنشاہ دل افروز سودا مردم چشم بتاں ہوں ہوس ہے روضہ اندر کو دیکھوں	کہ پھیلائے ہوئے ہیں حرف و امن ادھر بھی اک نگاہ مصیبت سوز سویدائے دل ہندوستان ہوں جبین آستان پر سر کو دیکھوں	مبارکباد نعت مصطفیٰ ہے بہت کچھ ہو چکی غفلت پناہی عروس یاس ہم آغوش دل ہے بناؤں تو بنائے چشم بخواب	زباں پر نغمہ وصلیٰ علیٰ ہے بہت دیکھا عتاب کم نگاہی مری امید تجھ سے منفعل ہے غبار آستان پاک اصحاب
یکجہ اللہ کہ یہ نظم گرامی قدیمی رسم ہے متی میں اکثر نہیں مطلب مجھے اظہار فن سے طبیعت نے دکھائی گرمی شوق سخن کوتاہ اے تسلیم پر جوش	ہوئی گلگونہ حسن تامی نہیں رکھتا قدیم کیفی برابر بری ہوں دعویٰ شعور سخن سے سخن بن بن کے ٹپکی کثرت ذوق بہت کچھ کہہ چکا خاموش خاموش	ہوئی کم گو ہر افشانی زباں کی خراباتی ہوں زندانہ بیاں ہے ازل سے بسکہ ہوں دیوانہ عشق بہار آئی چین زار سخن میں نہ دے اب طول آہنگ فغاں کو	تراوش ہو چکی ابر بیاں گی زبان موج سے میری زباں ہے مجھے مرغوب ہے افسانہ عشق چہک اٹھے عنادل انجمن میں سکھا انداز خاموشی زباں کو

شام غریباں کے بعد تیسری مثنوی ”صبح خنداں“ ۱۲۹۴ھ میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کو استاد مرحوم کے زمانہ عروج
سخن کی آخری یادگار سمجھنا چاہئے کیونکہ ۱۳۹۴ھ کے بعد آپ کی شاعری کا تیسرا دور شروع ہو گیا، جسے ہم اور انخطاط سے
موسوم کر چکے ہیں۔ صبح خنداں مثنوی میر حسن کی بحر میں ہے اور اپنے طرز کی ایک ہی مثنوی ہے، مرحوم منشی متیر نے اسکی

تاریخ تصنیف حسب حال کیا، خوب لکھی ہے۔
میر اس کی تاریخ کا لکھنے حوالہ
کہ ہے یہ عجب ثمنوی بے مثال

۹۴ ۱۲ ۵

اس کے اول و آخر کے چند شعر ملاحظہ طلب ہیں:-

..... ہوئے دل مست حال	نور سخن دے رہا ہے خیال
عطا کر گئی دل سزاوار عشق	ہوا خواہ غم ناز بردار عشق
..... تا مہر پہنی رہے	دعا گوئے آشفہ جانی رہے

شفیق دلی مصوری و معنوی	محمد ظہیر احسن نیموی
سنی گوش دل سے کہانی مری	مزا دگئی خوش بیانی مری
لب گور سے روح میر و حسن	شب و روز ہے محو داد سخن

اپنی شاعری کے تیسرے اور چوتھے دور میں حضرت تسلیم نے اور بھی متعدد ثمنویاں لکھیں مثلاً:- دل و جان، تاریخ رامپور، سفر نامہ نواب رامپور، نغمہ بلبل، گوہر انتخاب، شوکت شاہ بہانی وغیرہ لیکن ان میں سے دل و جان اور گوہر انتخاب کے سوا اور کسی میں شاعری کا کوئی لطف نہیں ہے۔ دل و جان البتہ نادر من فیضی کی بحر میں بہت خوب لکھی ہے دور انحطاط کی اس تصنیف میں اگرچہ نالہ تسلیم یا شام غریباں کا سا زور کل اشعار میں نہیں ہے تاہم مجموعی حیثیت سے یہ بھی اپنے زمانہ کی تمام ثمنویوں سے بہتر قرار پانے کی مستحق ہے۔ ثبوت کے لئے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

پھر امین حمد و پرو ہے	پھر مجھ کو خدا سے گفتگو ہے
پیدا و نہاں برنگ بو ہے	جو گل ہے چمن طراز ہو ہے

اے پیر مغاں فداک روحی	آیا دم ریزش صبو حی
یوں آتش قصہ الم سے	پیدا ہیں شررِ رگ قلم سے
ہونے لگی بخت بد سے آغاز	نار استی سپہر کج باز
دستور نے جب سنایہ نیزنگ	بھڑکارگ دل میں شعلہ ننگ
سلطان سے کسی نے دوستانہ	دونوں کا بیاں کیا فسانہ
ہراک نے پس تامل غور	کی عرض کہ لے شہ فلک دور
عقد دل و جان اگر بہم ہو	مکن ہے کہ شور عشق کم ہو

صد نگر کہ یہ فسانہ عشق	مینائے شراب خانہ عشق
امید یہی ہے اہل فن سے	جب شاد ہوں شیوہ سخن سے
اب پیر ہوں شاعری سے کیا کام	ایجاد سخنوری سے کیا کام

لبریز ہوائے سخن سے	پکی مستی لب و دہن سے
چاہیں مری مغفرت خدا سے	گوشل کریں ہدیہ دعا سے
اک عادت لغو پڑ گئی ہے	یہ پچانس جگر میں گڑ گئی ہے

دشوار ہے جبکی پیارہ سازی ممکن نہیں اس سے بے نیازی اچھی ہے کہ سب طرح بُری ہے یہ پانچویں میری مثنوی ہے
مثنوی گوہر انتخاب شہر مانگروں کی تعریف اور وہاں کے مقابر و مساجد وغیرہ کے بیان میں ہے آخر میں نواب صاحب
مانگروں کی جشن شادی کا کچھ حال لکھا ہے۔ اس کے بھی چند شعر سن لیجئے:-

اپنی تو ہے کار ساز جہاں	تجھی سے ہے پر نغمہ سا جہاں	کئے تو نے پیدا سب اسباب عیش	کیا کرتے ہیں عیش ارباب عیش
ہم آغوش ہیں کامرانی کے ساتھ	دل آسودہ ہیں شادمانی کے ساتھ	طرب گاہ دنیا میں لیل و نہار	عروس تمنا سے ہیں ہلکار
آٹھا دل میں طوفان مشق کہن	ہوا موجزن بحر نظم و سخن	کہی اک مہینے میں یہ مثنوی	دکھائی دم فکر کیا کیا نوی
مرے ایک ہیں ہمزباں ہم سخن	ہوا خواہ یاران ارباب فن	سخنداں سخنگو سخن دستگاہ	جوان و جوان طبع فیروز شاہ
بڑی مشق تاریخ کوئی میں ہے	رسانا فکر اعداد و جوتی میں ہے	سنی مجھ سے جسوقت یہ مثنوی	ضعیفی میں پائی طبیعت قوی
پئے سال اندک کیا دل میں غور	دکھایا یہ زور طبیعت کا طور	کیا دفعتاً میری جانب خطاب	کہ لکھو یہ ہے گوہر انتخاب

اقتباسات مندرجہ بالا کو نگاہ انصاف سے دیکھنے کے بعد ہمارے اس دعوے کو قبول کرنے میں غالباً کسی شخص کو کچھ عذر نہ ہوگا
کہ متاخرین میں اردو زبان کے کسی استاد نے استاد تسلیم سے بہتر مثنوی نہیں لکھی۔ حضرت شوق قدوائی شاگرد اسیر نے البتہ
حال میں ایک مثنوی قاسم و زہرہ اچھی لکھی ہے لیکن اس کا جدید رنگ مثنوی کے قدیم طرز سے بالکل علحدہ ہے اس لئے ان
دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) قصائد - عروج فکر کے زمانے میں تسلیم کے قصائد بھی زیادہ تر تسلیم کے رنگ سخن میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے یعنی آپ
مضمون کی بے زری اور بن غت کو الفاظ کی رنگینی اور فصاحت کے بہار آفریں جامے میں اس خوبی کے ساتھ نمایاں کرتے تھے کہ
اکثر موقعوں پر قصیدے میں غزل کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی "صورت مینا ہیں لبریز سخن کام و دہاں"۔ مرزا نسیم کا مشہور قصیدہ
ہے، جس میں انھوں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ "ہوں قصیدے میں غزل کی کچھ ادا رنگینیاں" دیوان اول میں تسلیم کا
"قیدہ ششم در مدح سلطان عالم محمد واجد علی شاہ" بھی اسی زمین میں موجود ہے، مرتبہ شناسانِ لطف گفتار دیکھیں کہ
استاد مرحوم نے اس قصیدے میں کیسی کچھ گانفشانیاں کی ہیں اور نسیم کے اسلوب کلام کی کامل پیروی میں کہاننگ کامیاب نہیں
نغمہ سنجی کے قابل نے سزاوار فضاں
بہل تصویر ہوں رکھتا نہیں گویا زباں،

ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھ کو غیب سے
بسکہ ہوں فینس نسیم دہلوی سے کامیاب
بوئے گل ہوں گل کو بھی صحت مری ہے ناگوار
عین پستی میں خیال سر بلندی ہے وہی
ہوشیار اسے خامہ بیہودہ پیا ہوشیار
مطالع مضمون عالی یاد آیا ہے مجھے
سینے میں مانند دل ہوں ولیم ہوں مثل گماں
کونگ ہے آگے مرے سحبان وائل کی زباں
ہوں سبکدوشی سے اپنی طبع نازک پر گراں
ہوں ترقی آشنا مثل غبار نالواں
تا کجا وقف زباں آئین و رسم شاعران
جس سے پیدا ہے عروج التماس قدسیاں

بورے روئے زمین لیتا ہے کیا کیا آسمان
چلتی ہے باد صبا کرتی ہونی انگھیلیاں

اوج دکھلاتا ہے سن پست فطرت ہر زمان
جوش مستی میں جوانانِ چمن کے سامنے

منبر ہر شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عنذلیب
جس کی ادنیٰ ریزش زر کی بدولت دہریں
جس گھڑی دیکھے نگاہ قہر سے سوئے عدو
اس کے کوچے کی ہوائیں رشک انفاس مسیح
آفت امید کافر، لطف جان حق پرست
آسمان بخت و دولت آفتاب غزو جاہ
باعث تسکین دل آرام حباں مبتلا

اسی زمین میں امیر مینائی مرحوم کا بھی ایک قصیدہ نواب
فضل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں
ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرمی
نوع و سان چمن کو ہے جواہر کا جو شوق
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہال سایہ دار
چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے
غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکرا احسان بہار
گرچہ صحن باغ میں ہر سال آتی ہے بہار
ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہو مسند نشین
منع جو دو سخاوت معدن لطف و کرم
انتخاب صنع حق عالی نسبت والا حسب
نام نامی وہ کہ ہے سب کے نگین دل پہ نقش

یہ ہیں :-

خطبہائے مدحت و اجد علی شاہ جہاں
مختصر ہے طول دامن زمین و آسماں
عافیت پیدا کرے تاثیر مرگ ناگہاں
اس کی چو کھٹ سجدہ آموز جبین انس جاں
برق کشت شرک، ابر نو بہار مومنان
مشرق صبح سعادت مطلع نام و نشان
لمعہ نور خدا روح تن روحانیان

نواب کلب علی خاں بہادر کی شان میں ہے جس کے چند منتخب شعر
بڑھکے رضواں سے ہے ان روزوں دماغ باغباں
جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز محفل کی دوکالی
بیچنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں
ہو لحرمان جس طرح کوئی سپن دامن کشاں
چادر مہتاب ہے فرش فنا کے بوستاں
وہ زبان بیہن ہے یہ دمان بے زباں
اور آتا ہے نظر رنگ زمین و آسماں
سرو گلزار ریاست صاحب بخت جواں
اے اوج چرخ قدرت مہر اوج کن فکاں
روح جسم انس و جاں فخر زمین و آسماں
نامور کلب علی خاں بہادر نوجواں

پختگی کلام اور شعر کی عام خوبیوں کے لحاظ سے امیر و تسلیم کے قصاید میں سے ہم کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں
دے سکتے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الفاظ کی جو شادابی اور ترکیب کی جو دلفریبی قصیدہ تسلیم کی جان ہے امیر کے
یہاں اس کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔

مرحوم منشی منیر کی پُرگوئی اور قادر کلامی کا ایک زمانہ قایل ہے لیکن دور دوم کے قصاید تسلیم کی خوبی کو اس کا قصیدہ
بھی نہیں پہونچتا۔ منشی منیر کے ایک قصیدہ کا انتخاب ملاحظہ ہو :-

تلزم فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر
کس خدا دوست کے ہاتھوں میں پینے کے لئے
غسل سوت کی خوشی کون سے فیاض کی ہے
وہ فلک مرتبہ نواب نفسید الدولہ

اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دہ یا گوہر
کرتے ہیں دائۂ تسبیح سے رشتا گوہر
کس کے صدقے کے لئے لائے ہیں دریا گوہر
صدقہ قدرت حق کا ہے جو یکتا گوہر

دست پر نور سے سایل کو جو بخش گوہر ہو گیا دست گدا میں بد بیفتا گوہر

فیضِ والا سے نہیں اہل عدم بھی محروم
فرطِ بخشش سے ہوئے بے غنا گوہر
ابر و اہل صفا کی یہ بڑی تیرے حضور
ہو گئے خاکِ کھنڈ پا سے مصفا گوہر

ختم کرتا ہے دعا پر تری تعریفِ منیر
ابر نیساں رہے جب تک کہ درافشاں یارب
میرے نواب ہمیشہ ہوں صحیح و سالم
اس کے مقابلہ میں تسلیم کا ایک قصیدہ ملاحظہ ہو جو
ٹپکے ہیں دیدہ بخواب سے کیا کیا گوہر
بے ثباتی کو مری دیکھ کے آنسو کی طرح
تھا وہ غم دوست کہ صناعتِ ازل کے آگے
دیتے ہیں اہل صفا اہل صفا کو قوت
کس طرف جوش میں جاتا ہے کدھر ہے تسلیم
عذر شوریدہ سری ہے جو تجھے سن ہم سے

ہاتھ آتا نہیں اب نظم کا اچھا گوہر
قلزمِ دہر میں جب تک کہ ہوں پیدا گوہر
مسند آرا رہے تاحشر یہ والا گوہر
انہوں نے واجد علی شاہ کی مدح میں لکھا تھا :-
دیکھتے دیکھتے مٹ مٹ گئے کیا کیا گوہر
خود بخود ٹوٹ گیا ہاتھ جو آیا گوہر
اشک ہوتا میں بگڑ کر جو بناتا گوہر
صنعتِ دل کے لئے لکھتے ہیں اطبا گوہر
تاکجا تار پریشاں میں پروتا گوہر
مطلعِ صاف کہ ہر نقطہ ہو جس کا گوہر

غور سے دیکھ ذرا ہم دم والا گوہر
یہ دل و جاں ہے دل و جان صفا طینت کا
اس سے ہے حشر تک زینت نامِ مدوح
گمراہ ہے تو چل منصفِ دوراں کے حضور

آبرو میں در مضمون ہیں سوایا گوہر
آئینہ ہے جگر چاک صدف کا گوہر
چند دم ہے سببِ رونق دنیا گوہر
نہ رہے شک سخن اچھا ہے کہ اچھا گوہر

یونہی چند رہا حوصلہ سرف و کرم
پر تو عارضِ روشن جو دکھائے اعجاز
نقش پا ہے سببِ زینتِ عالم ایسا
واجد علی شاہ کی مدح میں آپ کا ایک اور قصیدہ قابلِ دید ہے :-

عالم بحر میں ہو جائے گا عنقا گوہر
دمِ گفارہ ہو اک دیدہ بینا گوہر
جیسے ہو تاج سر شاہ کو زیبا گوہر

ہر دم ہے دمِ خنجر براں کے برابر
ہر روز تمنا شبِ ہجران کے برابر
کیا کیا ہیں گرم گردشِ دوراں کے برابر
گردابِ یم گریہ گریباں کے برابر
رک جاتے ہیں آکر سرِ مرزاں کے برابر
امید مری حشر گریزاں کے برابر
ہر چند کہ ہوں ناظمِ سرداں کے برابر
ہر مشکل دشوار ہے آساں کے برابر

ناکامی قسمت سے ہے مجھ کو تہِ گروں
تدبیرِ سحرِ شام کو ہوتی ہے دگرگوں
روتا ہوں یہ قسمت کو کہ رہتا ہے ہمیشہ
آنسو بھی خفا ہیں جو خفا بخت ہو مجھ سے
کچھ منہ کو چھپائے ہوئے جاتی ہے عدم کو
ناقدری دوراں سے نہیں بات کے قابل
لیکن مجھے با اینہم ہر دت ہے تسکین

کہتا ہوں کوئی غم نہیں حامی ہے اگر شاہ جم مرتبہ شوکت میں سلیمان کے برابر
بلاخوت تردید کہا جاسکتا ہے کہ قصیدہ نگاری کا یہ رنگ لکھنؤ کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ بلکہ مرزا نسیم کے
بعد ظہیر کے سوا اور کسی دہلوی شاعر سے بھی اس کی پیروی نہ ہو سکی۔ مگر واضح ہو کہ تسلیم کے یہ کل قصیدے ان کے پہلے دیوان
سے نقل کئے گئے ہیں، دیوان دوم کا ابتدائی قصیدہ نواب کلب علی خاں کی شان میں اہلۂ سزاوار ستائش ہے اس کے سوا
دور سوم و چہارم کے باقی قصیدوں میں بتدریج کمزوری اور رنگ نسیم سے دوری پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔ یہاں تک کہ دیوان
سوم کے قصائد کی سطح شاعری دیگر شعرائے دہلی و لکھنؤ کی عام سطح سخن کے برابر بلکہ کہیں کہیں اس سے بھی بہت ہو گئی ہے
لیکن کمال فن کے اس اعجاز کو دیکھئے کہ ان معمولی قصاید کے بھی منتخب شعر اساتذہ معاصر کے منتخب اشعار سے اچھے نہیں تو
برے بھی نہیں ثابت ہوتے۔ ملاحظہ ہو:-

انتخاب قصیدہ جلال لکھنوی:-

کبھی نہ ہوں میں غم نشستین سے دلگیر
میں بادہ نوش ہوں اس میکدے کا لے زاہد
غم ایک جس کا ہے تسنیم دوسرا کوثر
دکھائے آئینہ بہشتوں کی سیراک ساغر
وہ بادہ جس سے ہو تر دامنوں کا دامن پاک
وہ بادہ جس سے گنہگار غرق رحمت ہو
وہ مے ہوائے چمن جس کے کیوں سے سرشار
وہ مے کہ جس سے غرض حُبِ ساتھی کوثر
جدا ہے نام مبارک کی ہر گھڑی تاثیر
پیر ہے تیغ حوادث کی نام حیدر کا
امید کو دل اعدا میں قطع کرتی ہے
نیام سے یہ نکل کر اماں نہیں دیتی

دکھائے توسن والا جو شوخی رفتار
ارادہ سیر فلک کا کرے تو یوں پہونچے
قبول کیجئے مولا اب التماس جلال،
جو ہیں مرے عمل پر وہ نیک ہو جائیں
انتخاب قصیدہ تسلیم:-

بتاؤں کیا تجھے ہدم میں کب سے ہوں دلگیر
فریب خوردہ جو رفلک ہوں بعد فنا
دم ازل مجھے قسام درد و حسرت نے
جو دیکھوں رحم کی امید پر فلک کی طرغ

شباب چرخ تھا نا کامیاں تھیں میری پیر
چڑھائیں گے مری تربت پہ سب گل تصویر
دیا ہے نالہ بے سود و آہ بے تاثیر
کنچی ہوئی نظر آئے ہلال کی شمشیر

بزرگ داغ دل لالہ داغ دل کا مرے علاج ہے نہ مداوا نہ چارہ و تدبیر

مہنوز کثرتِ فیض نسیم و مومن سے کمی نہ جوش سخن میں نہ فکرمیں تقصیر
پڑھوں وہ شکوہ بیداد دہریں مطلع کہ جس کوسن کے پشیاں ہو چرخ پر تزییر

پس فنا بھی خموشی دکھائے گی تاثیر
ہمیشہ خاک بسر ہوں بہ شکل نقش و قدم
بزرگ شعلہ زباں دی ہے وہ کہ غیر تو کیا
جہاں میں ہوں مگر انجام کار سے مایوس
بنا ہوں کا ہمیشہ پیہم سے نقطہ موہوم
جنوں میں زیور دیوانگی بھی برہم ہے
وہ ننگ ربط ہوں کھینچے ہزار طرح کوئی
اگر یہی سر تکلیف ناتواناں ہے
لگی ہوئی مرے دل کی بجھے نہ محشر تک
کراہتا ہوں سحر تک ہجوم درد سے میں
نہیں پناہ کہیں جو آسماں سے مجھے
محیط جو دو سپہر چشم حسین میاں

رہے گی خاک مری صرف گردہ تصویر
خط غبار ہے شاید مرا خط تقدیر
مرے بھی فہم میں آتی نہیں مری تقریر
نصیب دیدہ غفلت ہے خواب بے تعبیر
نہیں میں قابل گنجائش قلیل و کثیر
قدم قدم پہ اُلجھتی ہے پاؤں کی زنجیر
ٹے نہ مجھ سے کسی رنگ میں مری تصویر
تو پائے مور میں پہنائے گا فلک زنجیر
ہزار گور غریباں پہ روئے ابرِ مطہر
خدا گواہ ہے شاہد ہے نالہ شبگیر
سوائے بارگاہِ داور جہاں تسخیر
رئیں ابن رئیس و امیر ابن امیر

چمن فروش ہو تیرا جہاں گل تقریر
یہ دلنشیں ہے نہ ہو محو روز محشر تک
ترے بغیر ہے تہذیب کا رملک محال
احاطہ مجھ سے ہو کس طرح تیری مدحت کا

انتخابِ قصیدہ تسلیم (تصفیہ دور چہارم) درتہنیت
ہوا بیدار خواب ناز سے جب خسرو قادر
عروس صبح نے کچھ کچھ دکھائی جلوہ افروزی
شب افروزی سے پائی ثابت سیار نے فرصت
بدل دیں صورتیں گلزار میں عکس شعاعی نے
پھرے سوئے ریاست ممبئی سے یوں شب والا
فریدیوں مرتبہ حامد علی خاں صاحب شوکت
مجھے حیرت ہے دوں تشبیہ کس سے شان شوکت میں
نہیں ہیں نام کے بذکار بھی تعزیر سے سنجیم

مکاں ہو غیرت فردوس خاک رشکِ عبیر
کمریں جو نام ترا سطح آب پر تشریف
جہاں عروس ہے مشاطہ ہے تیری تدبیر
محال ذرہ کرے آفتاب کو تسخیر

والپسی نواب صاحب رامپور از ممبئی :-
اٹھایا چاندنی نے فرش روئے خاک سے بہتر
بنا اک قرص کا فوری مہ پر نور گردوں پر
فلک پر جھلملائے صورت شمع سحر اختر
بنے شبنم کے قطرے روئے گل پر ریزہ افگر
کہ جیسے غرب سے مشتاق مشرق خسرو قادر
کہ جس کا نقش پا ہے تاج فرقِ نجر و قیصر
نہ دارا شہ کا ہمرتبہ نہ ہمایا ہے اسکندر
چھپامٹی میں معشوقوں کے ہے دزدِ خانا جاکر

یہاں تک عہد میں اسکے ستمگر مہر پیشہ ہیں کہ شیر گرسنہ جیتا ہے غم رو باہ کا کھاکر
 رہے محفوظ ہر آفت سے زیر چرخ محشر تک جو لکھ کر نام نامی باندھے انسان اپنے بازو پر
 دعائیں دیتی ہے مخلوق ہر دم جان سے دل سے کہ اے پروردگار دو جہاں اے خالق اکبر
 رہیں حامد علی خاں شوکت و اقبال دولت سے تری ظل حمایت میں سلامت تادم محشر
 قصاید تسلیم کے ہر دور سخن کا نمونہ دیکھنے کے بعد نکتہ سنج طبائع کو بشرط حق شناسی یہ بات ماننا پڑے گی کہ عہد نسیم
 میں بلکہ اس کے دس سال بعد تک مرحوم شمنوی نگاری کی طرح قصیدہ نگاری میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ ایسے یکتا کہ
 حالت زوال میں بھی ان کے قصیدے اپنے معاصرین کے قصاید سے رتبے میں کسی طرح کم نہیں رہے :-
 ایں سعادت بزور بازو نیست
 تانہ بخشد خداے بخشندہ

غزلیات عہد پیری میں زوال سخن کا اثر سب سے زیادہ حضرت تسلیم کی غزلوں پر پڑا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قصیدہ و شمنوی میں
 فی الجملہ شوکت، الفاظ یا خوبی بیان سے بھی کام نکل جاتا ہے۔ لیکن غزل کا جال بالکل جداگانہ ہے۔ یعنی یہ کہ
 اگر ہمیں جذبہ شوق کی نمود نہ ہو تو دہلی کا طرز کسی طرح غزل میں پسندیدہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ زمانہ پیری کی فطری
 افسردگی افکار دنیا کے بھوم کے ساتھ ملکر جذبات محبت کے مٹانے میں اکثر اس درجہ کامیاب ثابت ہوا کرتی ہے اس کا مقابلہ کرنا
 میر و مصطفیٰ کے سے چند مستثنیٰ شاعروں کے سوا ہر شخص کا کام نہیں ہے، چنانچہ ذوق و شوق کے تدریجی زوال کے ساتھ ظہیر و تسلیم
 و جلال کی شاعری اور شونہ و زندہ دلی کے زوال کے ساتھ داغ کی شاعری روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ تسلیم کے
 دیوان سوم کی غزلوں کو دیوان اول کی غزلوں کے ساتھ کوئی مناسب ہی نہیں معلوم ہوتی۔
 بر خلاف اس کے طرز لکھنؤ میں خوب شعر کا دار و مدار کلام کی پختگی اور زبان کی درستی پر ہوا کرتا ہے۔ جس میں کمال حاصل
 کرنا مشق سخن کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ مشق سخن عمر کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے تمام
 معاصرین کی شاعری کے برعکس امیر بینائی مرحوم کی سخن سنجی میں شباب کا رنگ پیدا کیا اور بڑھاپے میں جوانی کی بہار دکھائی۔
 بہر حال تسلیم کی غزلسرائی کا بہترین زمانہ ۱۲۶۵ھ سے ۱۲۸۹ھ تک رہا، اس عہد کی غزلیں دیوان اول نظم ارجمند نام
 میں درج ہیں، اس کے بعد ۱۲۸۹ھ سے ۱۳۱۹ھ تک کی غزلیں بھی غنیمت ہیں کہ جہاں ان کے اکثر اشعار بے لطف ہیں وہیں
 بعض شعر ایسے بھی ملتے ہیں جن میں دور اول کی تمام خوبیاں بدستور موجود پائی جاتی ہیں، ان اشعار کو دیوان دوم سوم بہ نظم
 دل افروز کی جان سمجھنا چاہئے۔ دفتر خیال یعنی دیوان سوم میں ۱۳۱۹ھ سے ۱۳۲۹ھ تک کی غزلیں ہیں ان میں سے صرف
 دس یا بارہ غزلوں کے منتخب اشعار تو بیشک دیوان اول کی غزلوں کے برابر رکھے جاسکتے ہیں، باقی کی نسبت بھرتی کی غزلوں کے
 سوا اور کوئی خطاب موزوں نہیں معلوم ہوتا بطور ثبوت ملاحظہ ناظرین کے لئے ہم تسلیم کے ہر سہ دواوین سے ان کی چند
 غزلیں اپنی مختصر رائے کے ساتھ ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں۔

غزلیات دیوان اول شاہی زمانہ میں شعرائے لکھنؤ کے طبائع پر ناسخ اور پیروانِ ناسخ کا رنگ اس قدر چھایا ہوا تھا
 کہ اس کے مقابلہ میں نسیم کے دہلوی طرز کا بھی کم از کم ایک محدود طبقے میں مقبول ہو جانا سراسر
 حیرت انگیز نظر آتا ہے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ عبداللہ خاں قہر۔ امیر اللہ تسلیم، اشرف علی اشرف وغیرہ کی شاعری نے جو نسیم کے
 درود لکھنؤ سے قبل تک خالص لکھنؤ کی شاعری تھی نسیم کے زیر اثر وہ کیفیت پیدا کی کہ دہلی کا خاص رنگ بھی اسکے آگے ماند

پڑ گیا، چنانچہ تسلیم کی ان غزلوں کو پڑکھ کر جس میں نسیم کا رنگ غالب ہے کوئی انہیں لکھنوی شاعر نہیں سمجھ سکتا۔ مثلاً:-
 وصل کی شب بھی ادائے رسم حراماں میں رہا
 مر گئے لاکھوں شبیہ ناز کچھ پروا نہیں
 کام اپنا کر چکی بیماری عشقِ بتال
 وادے پاس دقا اندری شوم آرزو
 کیا پڑھے اشعار تسلیم جگر اٹکارنے
 صبح تک میں اتنا شوق نہیں میں رہا
 وہ تماشا کئے ہلال عید قرباں میں رہا
 میں فریبِ فتنہ و تاثیر درماں میں رہا
 ہر نفس ہمارا ہی عسبر گریزاں میں رہا
 شورِ تحسین ہر طرف بزمِ سخنداں میں رہا

زور دکھلاتا ہے کیا کیا ضعفِ جسم زار کا
 سخت جاں پہل ہاتھ ایسا آج لے قاتل لگا
 رحم کے بدلے کچھ احسانِ عداوت اور بھی
 رنگ اڑنے کو ترستا ہے مرے رخسار کا
 معرکے میں نام ہو جائے تری تلوار کا،
 حوصلہ رکھ لے سوالِ زخمِ دامنِ دار کا

وصل میں کروٹ جو وہ شوخ جواں لینے لگا
 گو بظاہر ترک تھی الفت مگر جب آگئے
 بزمِ ساتی آگئی ہے یاد کس مینوش کو
 گرم مطلب دیکھ کر کہتے ہیں سو سونا سے
 ضبط سے دل رخصت آہ و فغاں لینے لگا
 شوق تنہا پا کے کیا جھٹکیاں لینے لگا
 جام چھلکا شیشہ مے ہچکیاں لینے لگا
 جب سلایا پاس تجھ کو مچھیاں لینے لگا

بوئے گل تھے چھپ کے نیکلے گلشنِ فانی سے ہم
 حشر میں لوٹ گئے کی پردہ پوشی کے لئے
 لازم و ملزوم ہیں تسلیم باہم فکر و شعر
 کیا دکھاتے منہ کسی کو شرمِ عریانی سے ہم
 مانگ لیں گے کچھ تمھاری پاکدامنی سے ہم
 معتبر ہم سے سخندانے، سخندانے سے ہم

طبعِ عالی سے اگر اوج بیاں پیدا کروں
 پاؤں کہتے ہیں ترے کوچے میں آکر ضعف سے
 اب بھی تم آؤ تو میں آنکھوں میں بہر کیا نظر
 میں ہوں اسے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی
 میں زمینِ شعر میں بھی آساں پیدا کروں
 تو گراؤں اور میں خوابِ گراں پیدا کروں
 ڈھونڈھ کر تنویری سی جانِ ناتواں پیدا کروں
 چاہئے استاد کا طرز بیاں پیدا کروں

ناز برداری میں شب گزری دنِ ناشاد کی
 ذبح ہو کر خون سے بھل نے پیدا کیا بہار
 معشر کا وعدہ ہے، زیرِ خاک چشمِ واسے میں
 تھی کبھی منت خموشی کی کبھی فریاد کی
 بوئے گل دیتی ہیں کلیاں دامنِ صیاد کی
 دیکھتا ہوں راہ اپنی ہستی برباد کی

یادِ سفر ملکِ عدم دل سے لگی ہے
 کوسوں ہے زمینِ خونِ شہیداں سے شفق گوں
 ہر دم مجھے نوگور کی منزل سے لگی ہے
 یہ آگ نئی خنجرِ قاتل سے لگی ہے

گرفتار و تدم ہوں تو ہے ٹھننے کی تمنا
مٹ جائے کہیں زندگی و مرگ کا جھگڑا
کیا کہتے ہو کیا بھول گیا میں دمِ خصلت
سویا ہوں شبِ وصل میں یا مر کے لحد میں
ہوں خاک تو اڑنے کی مرے دل سے لگی ہے
اسے تیغِ جفا اب تو یہی دل سے لگی ہے
ایک یاد تھار سی سو مرے دل سے لگی ہے
جب آنکھ لگی ہے مری مشکل سے لگی ہے

اہل نظر غور فرمائیں کہ رسمِ حرماں، اتباسِ شوق، شرمِ آرزو، احسانِ عداوت اور ہستی برباد میں ترکیب کا حسن دلاویزی کے اس درجے تک پہنچ گیا ہے جہاں تک مومن و پیروانِ مومن اور نسیم و شیدایانِ نسیم کے سوا اور کسی کو رسائی نصیب نہیں ہوئی، اس رنگ میں تسلیم نے جو کچھ کہا ہے ہمیشہ کہا ہے ایسا کہ ان کے معاصرین میں ظہیر دہلوی کو چھوڑ کر باقی اور کسی کل کلام اس کے ساتھ ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

طرزِ دہلی اور اندازِ لکھنؤ کے درمیان شاعری کا ایک اور بھی رنگ ہے جسے عہدِ ناسخ کے بعد عشق، تعشق، جلالِ حبیبِ کنٹوری اور نظمِ طباطبائی وغیرہ اکثر صحیح المذاق شعرا نے اختیار کیا، سوز و گداز کے لحاظ سے تو یہ رنگ طرزِ دہلی کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن مضامین کی ندرت اور اسلوب بیان کی متانت میں بیشک اس کے برابر اور پختگی نظم اور خوبی زبان و محاورہ کے اعتبار سے یقیناً اس سے بدرجہا بہتر ہے۔

استادِ تسلیم کی بھی وہ عزلیں جو زمانہ عروج کی فکر کی تصنیف ہیں اور جن میں لکھنؤ کا طرزِ سخن رنگِ نسیم سے مغلوب نہیں ہو گیا ہے زیادہ تر اسی درمیانی اندازِ کلام کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

نالہ بے چھڑے ہوئے خیر کے پیدا نہ ہوا
خون رلاتی رہی بدقالی شادی برسوں
مثل شمع تہ فانوس رہا جلوہ فگن
تھے وہ تصویر خیالی کہ سوا ٹھننے کے
ظلمتِ دل ہے وہی لاکھ جلایا غم نے
کیا کہوں چھوٹ کے میں اُس گلِ تر سے تسلیم
میں لب نے کی طرح آپ سے گویا نہ ہوا
زخم کی طرح مبارک مجھے ہنسنا نہ ہوا
اُس نے پردا بھی کیا ہم سے تو پردا نہ ہوا
مفت بھی کوئی خریدار ہمارا نہ ہوا
پھونک دینے سے بھی اس گھر میں اُجالا نہ ہوا
صورتِ نکہتِ برباد کہیں کا نہ ہوا

دعہ جو کیا شام کو وقتِ سحر آیا
اللہ ری ہمدردی یارانِ خسرات
جیتا ہوں نہیں جینے کی جب تک مجھے امید
آرام نہیں گردِ شبنمِ بیجا سے کسی کو
اسے داعِظِ مسجدِ رہ میخانہ بتادے
اعمال جو پوچھیں گے کہوں گا دمِ محشر
تسلیم بیاباں سے سو خانہ پھروں کیا
اس ماہ میں نورِ شید کا عالم نظر آیا
خالی جو ہوا شیشہ دل جام بھرا آیا
مرجاؤں گا بالیں پہ مسیحا اگر آیا
عالم مجھے فانوسِ خیالی نظر آیا
مستی میں نہیں ہوش کدھر تھا کدھر آیا
خالی دہن گور سقا کچھ خاک بھرا آیا
آیا دل عاشق کی طرح میں جدھر آیا

ایک دن بھی نہ میں شوق سے باہم آنکھیں
برسوں دیکھا کئے اسے شوخ تری ہم آنکھیں

سر کو زانو سے اٹھا وصل میں پردہ کیسا آج تو چار ہوں اور فتنہ عالم آنکھیں

سنگدل پیار کیا کرتے ہیں خوشخواروں کو سان سینے سے لگا لیتی ہے تلواروں کو
کیا ہوا وعدہ دوزخ ہے اگر اسے واعظ کیا وہ دھکی بھی نہ دیں اپنے گنہ گاروں کو
بند ہو آنکھ اسی طرح جا سے تسلیم موت ہی آئے کہیں ہجر کے بیداروں کو

گور تک شرمندہ یارانِ وطن سے جائینگے منہ چھپائے دامن چاک کفن سے جائینگے
اسے دل دیوانہ امید رہائی کس نے پیچ و خم کا ہیکو زلف پر شکن سے جائینگے

گریہی ہے عادت تکرار بنتے بولتے منہ کی اک دکھائیں گے اغیار بنتے بولتے
تھی تمنا باغِ عالم میں گل و بلبل کی طرح بیٹھ کر ہم تم کہیں اسے یار بنتے بولتے
میری قسمت سے زبان تیر بھی گویا نہیں ور نہ کیا کیا زخم دامن دار بنتے بولتے
کچھ سبب ہوگا وگرنہ بے سبب ایسا نہ تھا چھیڑ کر یوں آپ سے اغیار بنتے بولتے
آج عذر اتفاقاً تسلیم کل تک یار سے آپ کو دیکھا سو بازار بنتے بولتے

اب چند غزلیں ناسخ کے طرز کی بھی سن لیجئے اور دیکھئے کہ باشندہ لکھنؤ ہونے کی حیثیت سے عہدِ نسیم بھی استاد
مرحوم لکھنؤ کے اس مقبول عام رنگ کو یکقلم ترک نہ کر سکے کہیں کہیں بے اختیار اس ڈھب کی بھی غزلیں لکھ جاتے
ہیں اور ایسی لکھ جاتے ہیں کہ ان میں اور ناسخ کے کلام میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً :-

پھر خیال زلف برہم مشک افشاں ہو گیا پھر مرا مجموعہ خاطر پریشاں ہو گیا
جب گیا سب چین کو بے تیرے مارا پڑا برگِ خنجر تیر شاخیں غنچہ پریاں ہو گیا
آشنائے لذت زخمِ جگر طفلی سے ہوں شیر کا قطرہ مرے سینے میں پریاں ہو گیا
گھر کہا دل میں حسینانِ جہاں نے اس قدر رفتہ رفتہ اپنا پہلو بوسفستاں ہو گیا
اب کہاں تسلیم لطفِ صحبتِ جام و سہو چند دن احسانِ دورِ میفرودشاں ہو گیا

جب بہار آئے گی بلبل کا وطن جل جائے گا آتش گل بھڑکے گی سارا چین جل جائے گا
یہ تو کیا وہ سوختہ قسمت ہوں پہنوں کا اگر چادر آبِ رواں کا پیرہن جل جائے گا
دیکھ کر دندانِ دلب کو تیرے شرم و رشک پانی پانی ہوگا درِ غسل میں جل جائے گا
ان باتوں کو بیروت بے وفا میں کیا کہوں آگ بن جائے گا شکر برہمن جل جائے گا
لکھی ہے تسلیم ہم نے نوکِ شعلہ سے غزل دیکھ کر بد میں یہ انداز سخن جل جائے گا

دشمن جاں دشت میں سرتاواں ہو جائیگا ذرہ ریگ پریدہ آسماں ہو جائے گا

تیرکھا کر ہم کریں گے شکر قاتل کا ادا
خط نکل آئے گا اگر دن روئے آتشاک پر
زخم تن ہوگا وہاں پیکاں زباں ہو جائے گا
شعلہ بھی میرے رلانے کو دھواں ہو جائے گا

مر کے دل مضطر ہے یاران جہاں کے واسطے
ہم صغیری سے ہوا ثابت مجھے صیاد کی
یہ جس نالہ ہے اپنے کارواں کے واسطے
ہمزباں ہوتا ہے دشمن ہمزباں کے واسطے
کم نہیں زنداں سے دارستہ مزاجوں کو وطن
باعث وحشت ہے تن عمر رواں کے واسطے

ان غزلوں کے خشک اور بے لطف ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے مگر افسوس ہے کہ ۱۲۸۹ء کے بعد تسلیم کا کلام روز بروز فیسم کے رنگ سے دور اور اسی طرز لکھنؤ سے زیادہ نزدیک ہوتا گیا۔ چنانچہ آپ کے -

دیوان دوم کی غزلیں دیوان اول سے زیادہ - اور دیوان سوم کی غزلیں دیوان دوم سے زیادہ بے رنگ اور بے اثر ہیں۔ طرز لکھنؤ سے قطع نظر کر کے ذیل میں دیوان دوم سے چند ایسی غزلوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جن میں فیسم کے انداز کلام یا دہلی و لکھنؤ کے درمیانی طرز سخن کی پیروی کی گئی ہے۔

(۱) مرزا نسیم کا انداز :-

کل مرا تھا آج وہ بت غیر کا ہونے لگا
یا د میری آگئی منہ پھیر کر رونے لگے
ہائے کب اُس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
آہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا، شکر ہے
بام پر جب تک وہ مہر حسن ہے سرگرم سیر
خوب رویا بیٹھ کر دانگی کی جان کو
یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا
انجن میں ان کی جب ذکر وفا ہونے لگا
درد کی لذت سے جب دل آشنا ہونے لگا
بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
بھیڑ کیوں چھٹنے لگی کیوں راستا ہونے لگا
جب مری نظروں سے وہ پنہاں قافلہ ہونے لگا
جب دوا کی ہم نے درد دل سوا ہونے لگا

یہاں تک عالم ہستی میں مشتاق عدم آیا
نہ بھولیں بعد مردن بھی فریب حسن کی باتیں
سہ کاری نے دی تکلیف اسکے جوش رحمت کو
کہ پیغام اجل سمجھا جو لب تک میرا دم آیا
فسانہ یار کا کہتا ہوا دل تا عدم آیا
ہماری خاک پر روتا ہوا ابر کرم آیا

دل میں کیا آئی تھی کیا اے گلزار آنے کو تھی
شہرت رنگیں خرامی سن کے صحن باغ میں
آبول کا ہو کے چرچا رہ گیا اچھا ہوا
گرمی صحبت سے کچھ مطلب نہ دلسوزی سے کام
آج لب پر کیوں نہیں ہے اختیار آنے کو تھی
آپ کے لینے قدم باد پہاڑ آنے کو تھی
یہ حکایت تاز زبان نوک خار آنے کو تھی
کیوں لحد پر میری شمع اشکبار آنے کو تھی

تھک گئے تم حسرت ذوق شہادت کم نہیں
روز مرتے ہیں ہزاروں دیکھ کر نیرنگ حسن
بے ثباتی پر بہار باغ کی روتا ہے چرخ
مجھ سے دم لیلو اگر تیغ ستم میں دم نہیں
گر یہی عالم تمہارا ہے تو یہ عالم نہیں
روئے گل پر قطرہائے اشک ہیں شبنم نہیں

اچھے اچھے بت کے بندے اسے خدا ہونے لگے
انتہا کی بے نیازی ابتداءے عشق میں
بانگین سکھلا رہا ہے ان کو بیرحمی کے ڈھنگ
ڈر رہے بول اٹھے کہیں ان کی طرف ہو کنوئل
فصل گل آئی بڑھے دست جنوں کے دلوں
وقت آخر ہے انھیں رخصت کرو تسلیم اب
عاشق اس کا فرادا کے پارسا ہونے لگے
تم ابھی سے بیوقوف بیونا ہونے لگے
آج کل میں کیا عجب مشق جفا ہونے لگے
سامنے اللہ کے جب فیصلہ ہونے لگے
ٹکڑے ٹکڑے جیب و دامن قبا ہونے لگے
کون جانے کیا ہو دم میں کیا ہے کیا ہونے لگے

(۲) دہلی و لکھنؤ کا درمیانی انداز سخن

پھول سے رخ کا نظارہ ہمیں کرنے نہ دیا
راز پوشی تھی محبت میں یہاں تک منظور
عہد کے بعد لئے بوسے دہن کے اتنے
اس کو کیا ضد تھی کہ اکدن بھی قفس میں مجھ کو
دم پیری بھی نہ ہشیار ہوئے ہم تسلیم
دامن دل گل امید سے بھرنے نہ دیا
عشق کی چوٹ کو بھی دل نے ابھرنے نہ دیا
کہ لب جو دوپشیاں کو مکر نے نہ دیا
مژدہ آمد گل باد سحر نے نہ دیا
جاگتے وقت سحر خواب سحر نے نہ دیا

بھڑکی ہے لگی دل کی بجھا کیوں نہیں دیتے
منظور ہے تسکین دل مضطر کی جو ناصح
ہاں بیٹھے ہیں در پر صفت نقش قدم ہم
پہر دم طلب سے جو نفرت ہے تو احباب
شمشاد اکڑتا ہے و تدیار سے تسلیم
آب دم شمشیر بلا کیوں نہیں دیتے
دم بھر کے لئے ان کو بلا کیوں نہیں دیتے
دعویٰ ہے تو اغیار اٹھا کیوں نہیں دیتے
خم کوئی مرے منہ سے لگا کیوں نہیں دیتے
شاعر ہو کوئی شاخ لگا کیوں نہیں دیتے

غزلیات دیوان سوم
ضعف کلام کے آثار جو تسلیم کے دیوان کی بعض غزلوں سے پیدا ہو چکے تھے۔ دیوان سوم
میں اس حد تک نمودار ہیں کہ قریب قریب اس کی ہر غزل میں دریافت ہو سکتے ہیں، جس کا
اعتراں جا بجا از راہ انکسار خود مصنف مرحوم نے بھی اس طور پر کیا ہے کہ
ہماری شاعری تسلیم اب ہے بدھو اسی کی خلافت فن اگر دیکھے نہ تیور نکتہ چیں بدے

نتیجہ سمجھے اسے تسلیم عمر بدھو اسی کا اگر میری غزل میں نکتہ چیں کوئی خلل دیکھے

مضامین اکثر پامال اور تازگی سے خالی ہیں۔ بندش میں نہ وہ چستی باقی ہے نہ ترکیب میں وہ استواری۔ جابجا الفاظ کے آخر میں حروف علت کا دیکر نکلتا مذاق سلیم کو حد درجہ ناگوار گزرتا ہے مثلاً:-
تسلیم ہیں یاران جنوں شوق کے پتلے کس روز بگولا گلے اٹھ کر نہیں ملتا

کس نے چارہ گر درد تو تدبیر میں ہے ہو رہے گی کبھی صحت بھی جو تقدیر میں ہے

شکل جو ہر تھا گرفتار میں تلواروں میں عمر اپنی کٹی دنیا کے ستمگاردوں میں
ایک ہی مضمون کو بار بار نظم کرنا بھی عیوب شاعری میں داخل ہے مگر تسلیم کے آخری دیوان میں اس کی بھی متعدد مثالیں موجود ہیں جیسے:-

اعمال جو پوچھیں گے کہوں گا دم محشر خالی دہن گور ستھا کچھ خاک بھر آیا
= دیوان اول کی ایک غزل کا مشہور شعر ہے۔ دیوان سوم میں اسی مضمون کے کئی شعر لکھے ہیں۔ مثلاً:-
کیا کہوں عالم ایجاد میں کیا کر آیا دہن گور ستھا خالی میں اُسے بھر آیا

یارانِ عدم کیا کہیں کیا کام کر آئے خالی دہن گور ستھا ہم خاک بھر آئے
یہ سب کچھ صحیح ہے مگر کمال سخن دانی کے زور سے استاد مرحوم نے اپنی شاعری کے دور آخر میں بھی بعض بعض غزلیں ایسی نکالی ہیں جن کو ہم دہلی و لکھنؤ کے درمیانی رنگ کا بہترین نمونہ کہہ سکتے ہیں ملاحظہ ہو:-

ہے وہی ہشیار جو دیوانہ تیرا ہو گیا عقل کھو کر عشق میں بہلول دانا ہو گیا
ناز سے چھاتی پہ اُس نے پاؤں جسم رکھ دیا دل ہوا ٹھنڈا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا
ہم نے پالا مدتوں پہلو میں ہم کوئی نہیں تم نے دیکھا اک نظر سے دل تمہارا ہو گیا
اگلا پڑتا ہے گلے ملنے کو خنجر میان سے بات کیا ہے دشمن جاں دوست ایسا ہو گیا
پر لگا کر اڑ گئی تقدیر سے شام وصال بات بھی کرنے نہ پائے ہم کو تر کا ہو گیا
اس کو کہتے ہیں رفاقت مر کے بھی چھوڑا نہ ساتھ داغ دل میرا مجھے داغ سویدا ہو گیا
جب سے اے تسلیم کی ہے بیعت دست سبوں دین ساغر ہو گیا ایساں مینا ہو گیا

نہیں بے وجہ رکنا آنسوؤں کا ہجر جاناں میں کوئی ٹکڑا جگر کا آگیا ہے چشم گریاں میں
نکالیں گے نیا رستہ جنوں فتنہ ساماں میں کریں گے رخنہ سر ٹکڑا کے ہم دیوار زنداں میں
ہوا میں زندہ جاوید ہو کر قتل اے قاتل، بھی تھی کیا تری شمشیر پہ خوں آب حیواں میں
حسینوں سے بگڑنا اور دل کو داغ دیتا ہے بہت روئی زلیخا بھی بکر یوسف کو زنداں میں

۱۔ مرحوم نے یہ غزل اس عظیم الشان مشاعرے میں پڑھی تھی جو ۱۹۵۲ء میں راقم حروف کے اہتمام سے علی گڑھ کالج کے اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا اور جس میں منجملہ دیگر مشاہیر میر میر مجروح بھی شریک تھے۔

شہیدانِ محبت کا نرالا سب سے کعبہ ہے
نظر گراے شکر ربط باہم اس کو کہتے ہیں
ڈراتا ہے مجھے تسلیم کیوں واعظِ جہنم سے
جھکائے سر ہیں محرابِ خم شمشیرِ عریاں میں
کہ پیکالِ دل میں ہے دل نازِ برداری پیکال میں
مرا حصہ نہیں ہے کیا خدا کے فضل و احساں میں

مرے دل سے تمنائے دکن کچھ اور کہتی ہے
بیاباں میں بہت خوش ہیں نہ وحشت ہے نہ سودا ہے
دمِ عرضِ تمنا وصل کی امید ہو گیونکر
میں شمعِ طور کہتا ہوں رخ پر نور کو لیکن
تمہیں تسلیم واعظِ دو زخمی کہتا ہے کہنے دو
مگر مرگِ امیر بیوطن کچھ اور کہتی ہے
مگر یادِ عزیزانِ وطن کچھ اور کہتی ہے
کہ غصے میں جبیں پر شکن کچھ اور کہتی ہے
تمہاری انجمن کی انجمن کچھ اور کہتی ہے
کہ حبِ اہل بیت و پیچتن کچھ اور کہتی ہے

بیہوش ہوئے آمدِ دلدار سے پہلے،
کس منہ سے کریں شکوہ رنجش کہ شب وصل
جاتا سوئے محشر ہوں دھڑکتا ہے مگر دل
گو جھوٹ تھا اقرارِ وفا دل کو ہمارے
کیوں نزع میں وہ دیکھ کے روتے ہمیں تسلیم
میں آئی ہمیں طالعِ بیدار سے پہلے
اک بات یہ بگڑے تھے ہمیں یار سے پہلے
کیا جانے کیا پوچھیں گنہگار سے پہلے
امید تو تھی آپ کے انکار سے پہلے،
مر جاتے اگر آمدِ دلدار سے پہلے

تصویر ہیں ہم عرضِ تمنا نہ کریں گے
کیا ہوگا اڑا دو گے اگر تیرے دل کو
تم ہو کہ عیدو سارے ستم ہوں گے زباں پر
تو بہ کریں تسلیم سے وجام سے تو بہ
اپنے لب خاموش کو گویا نہ کریں گے
ہم دل کی جگہ تیر کو سمجھا نہ کریں گے
ہم روزِ جزا پاس کسی کا نہ کریں گے
ایسا نہ کیا ہے کبھی ایسا نہ کریں گے

شکر بھی ادب پیش مشتاقِ اجل بیٹھے
سنا جسد کہ آتا ہے وہ قاتل قتل کرنے کو
ہجومِ بنخودی میں اب کہاں پاس ادب ہم کو
یقین جس کو نہ ہو اس شوخ فتنہ گر کی چھل بل کا
ظرافت دیکھئے تسلیم دلخستہ بھی پیری میں
اس غزل کے خوب ہونے میں شک نہیں مگر فتنہ گر کو "فتنا گر" اور دلخستہ کو "دلخستا" کہنا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔
رک رک کے دم پیری دم آنے کو کیا کہئے
جینے کا یہ عالم ہے مر جانے کو کیا کہئے

یہ غزل استادِ مرحوم نے راقم کی درخواست پر ۱۹۵۴ء میں رسالہ اردوئے معلیٰ کے لئے لکھی تھی۔

دشوار تھی جنبش بھی بیمار محبت کو
ہم نے تو یہیں دیکھا اللہ کے جلوے کو
گر شمع جلی جو بن محفل کا چمک اٹھا
اس ضعف میں دنیا سے اٹھ جانے کو کیا ہے
کعبہ نہ اگر کہنے بتجانے کو کیا ہے
پروانے کے بے حاصل جل جانے کو کیا ہے

بے وفا بیہر بے تاثیر ہو کر رہ گئی
دیکھ کر مجنوں کی حالت اس قدر حیرت ہوئی
نا توانی کی بدولت کاوشیں کیا کیا رہیں
اب کہاں وہ مہر بانی وہ عنایت وہ کرم
لاکھ جھٹکا ان سے نفرت سے سر بالین گور
پھر نہ دیکھا عمر بھر تسلیم وہ عہد شباب
آہ میری عرش کی زنجیر ہو کر رہ گئی
یہی محل نشیں تصویر ہو کر رہ گئی
سائنس بھی میری سنان تیر ہو کر رہ گئی
اول اول کچھ مری توقیر ہو کر رہ گئی
خاک میری پھر بھی دامن گیر ہو کر رہ گئی
آرزوئے نوجوانی پیر ہو کر رہ گئی

ان کے آنے کی خبر مشہور ہو کر رہ گئی
جب نقاب اٹھ دی عارض پر نور سے
کہدیا ہر بات پر ہاں ہاں مگر کچھ بھی نہیں
معرفت کی کیفیت ٹوٹے ہوئے دلیں محال
جی چرایا جس بلا سے سب نے وہ روز ازل
اب آخر میں چند متفرق شعرا اور ایک غزل اور سن لیجئے۔ اور مرحوم کو دعائے خیر سے یاد کیجئے کہ آسودگان خاک
کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

اللہ رے احسان ستم ضبط زباں کا
ہونٹوں نے مرے خواب بھی دیکھا نہ بیاں کا

چارہ ساز زخم دل وقت رفور رونے لگا
جی بھر آیا دیدہ سوزن لہو رونے لگا

تسلیم روئے یار کو حسرت کی آنکھ سے
اچھا نہیں ہے شوق میں سہرا دیکھنا

یادگار ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں
صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں

ہیں ناہائے چند، غزل کا بہانہ ہے
ماشوق ہوں میں مزاج مرا شاعرانہ ہے

مرے حسن ہاں افزا کے لئے،
مل گئے خاک میں شفا کے لئے

غیر سے ملے مجھے ناکام رہنے دیجئے
آپ اپنا نام و پیغام رہنے دیجئے

ہوئے جوان وہ جب ربط میں فتور آیا شباب ساتھ لئے حسن کا غرور آیا

پہلے اسے ذوق جفا تاب جاگر کو دیکھنا پھر کسی قاتل کے تیر رخنہ گر کو دیکھنا

بھول کر بھی کبھی حال دل شیدا نہ سنا تم سا بیرحم زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا
مشاعرہ علی گڑھ کے موقع پر میر مجروح کی فرمایش اشعار پر استاد مرحوم نے یہی مطلع اور ”بہتے بولتے“ والی
غزل سنائی تھی۔ گردش روزگار کے ستم کو دیکھئے کہ ۱۹۰۲ء کی یہ سرگزشت آج افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمیشہ
رہے نام اللہ کا۔

شمع کے مانند چلے سر اتر جانے کے بعد
شانہ آئینہ منگایا پھر کبھر جانے کے بعد
چاہئے انسان کو ہر وقت حفظ آبرو
نیم جلوہ کا ہوں یہاں دیکھ لیں اہل نظر
شکر ہے پرواز کے قابل کیا اللہ نے
ابتواے تسلیم ہیں اہل ہنر بھولے ہوئے

زندگی بخشی خدا نے ہم کو مر جانے کے بعد
بال زلفوں کے بگاڑے خود سنور جانے کے بعد
پھر گھر رہتا نہیں آب گھر جانے کے بعد
پھر نہ آؤں گا کبھی مثل شر جانے کے بعد
پھر قفس میں پر نکل آئے کتر جانے کے بعد
یاد فرمائیں گے کیا کیا مجھ کو مر جانے کے بعد

”نگار“ کے پُرانے پرچے

۱۔ جولائی۔ اگست۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر۔	۱۔ جولائی۔ اگست۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر۔
۲۔ فروری۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر۔ نومبر۔	۲۔ فروری۔ مئی۔ جولائی۔ ستمبر۔ نومبر۔
۳۔ مارچ۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۳۔ مارچ۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۴۔ فروری۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۴۔ فروری۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۵۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۵۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۶۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۶۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۷۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۷۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۸۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۸۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۹۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۹۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۱۰۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۱۰۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۱۱۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۱۱۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۱۲۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۱۲۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۱۳۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۱۳۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔
۱۴۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔	۱۴۔ مارچ۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی۔ اگست۔

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے علاوہ محمول (منجھڑ نگار لکھنوی)